UNIVERSITY LIBRARY
Date 23 OCT. 1936
ALLAHABAD
70 376

نگار

جلد ۲۷ | فہرست مضامین فروری ۱۹۳۵ء | شمارہ ۲

ملاحظات ۲

اشوزردشت — نواب نصیر حسین خاں خیال (مرحوم) ۹

ایک افسانہ جو مکمل نہ ہو سکا — اختر انصاری بی۔ اے (آنرز) ۱۸

مصطفٰے کمال کی زندگی کے چند دلچسپ اوراق ۲۴

صفیر بلگرامی — عبد المالک آروی ۳۱

مکتوبات نیاز ۴۳

گُمَّم — محشر عابدی بی۔ اے ۴۸

باب المراسلہ والمناظرہ ۵۴

چند دلچسپ نتائج مطالعہ ۶۰

ذوق کا مذہب — مالک رام ایم۔ اے، ایل ایل بی ۶۷

باب الاستفسار ۷۱

منظومات — اختر، شمیم، مخدوم محی الدین، فرخ۔ نبی احمد ۷۶

اس میں شک نہیں کہ سائمن کمیشن نے اہل ملک کے خیالات کا کافی مطالعہ کر لیا تھا اور اگر وہ دیانت سے کام لیتی تو ملک کے رجحانات کا ظ کر کے کوئی مناسب لائحۂ عمل پیش کرتی، لیکن افسوس ہے کہ اس کی کوئی سفارش ایسی نہ تھی جسے یہاں کا کوئی طبقہ قبول کر سکتا۔

یہ زمانہ وہ تھا جب کانگریس کا زور تھا اور ہر طرف سے یہی چیخ پکار سننے میں آتی تھی کہ اگر ملک کو آزادی کامل نہیں مل سکتی تو کم از کم ڈومینین ہوم رول اہی چاہئے جو برطانیہ کے دیگر مستعمرات کو حاصل ہے۔ اکابر قوم جیلوں میں بند کئے جا رہے تھے، بائکاٹ اور پکٹنگ کے سلسلہ میں روزانہ ت اور ارکان کانگریس کے درمیان تصادم کی خبریں آ رہی تھیں اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ملک شاید غلامی کی آخری ساعتوں سے گزر رہا ہے۔

حکومت برطانیہ چونکہ جنگ و صلح دونوں زمانوں میں اپنی نرم و گرم پالیسی کبھی نہیں چھوڑتی، اس لئے اس نے اگر ایک طرف قانون کے شکنجے میں ں کو کسنا شروع کیا تو دوسری طرف گول میز کانفرنس کے انعقاد کی تجویز پیش کر دی۔ اس سے مدعا یہ تھا کہ اہل ملک کی توجہ اس طرف مائل کر دی جائے۔ م از کم کوئی ایک ہی جماعت حکومت کا ساتھ دینے والی پیدا کر لی جائے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ حکمت عملی بہت کامیاب ہوئی اور سارا ملک گول میز کانفرنس کو کامیاب بنانے کا خواب دیکھنے لگا۔ اسکے بعد طرف کانگریس کا زور گھٹ جانے اور دوسری طرف برطانوی کابینہ کی تبدیلی نے ہوا کا رخ بدل دیا اور گول میز کانفرنس کا نتیجہ قرطاس ابیض صورت میں ظاہر ہوا۔

خیال تھا کہ قرطاس ابیض میں جو تجویزیں پیش کی جائیں گی وہ ملک کے ان مطالبات کے موافق ہوں گی جو گول میز کانفرنس میں پیش گئے تھے، لیکن جیسا کہ ابھی ظاہر کیا گیا، کابینہ میں قدامت پسند طبقہ کے اقتدار اور کانگریس کے کمزور پڑ جانے سے تمام امیدیں خاک میں ں اور جس طرح سائمن کمیشن رپورٹ کوئی صحیح چارۂ کار ثابت نہ ہوئی تھی، اسی طرح قرطاس ابیض بھی ایک بوسیدہ پارۂ کاغذ سے زیادہ نہ نکلا۔

خیر یہ تو جو کچھ ہوا سو ہوا لیکن تماشہ تو یہ ہے کہ اب جو پارلیمنٹ کی مشترک کمیٹی کی رپورٹ شایع ہوئی ہے، اور جس پر ہندوستان کا آئندہ آئین ت قایم ہونے والا ہے۔ وہ قرطاس ابیض سے بھی زیادہ عجیب و غریب ہے اور ہندوستان کے کسی طبقہ نے اس کو نگاہ پسندیدگی یں دیکھا۔ اس کی سب سے زیادہ اہم و اصولی تجویز یہ ہے کہ ہندوستان کے ہر صوبہ کو خود مختار کر دیا جائے، یعنی ہر صوبہ اپنے حالات کے ے جو قانون مناسب سمجھے طیار کرے اور جو طریقے اس کی فلاح و بہبود کے لئے موزوں ہوں ان کو عمل میں لائے۔ اس میں شک نہیں ولاً یہ تجویز نہایت مناسب ہے، کیونکہ ہندوستان کے مختلف حصوں کی آبادی اپنی تہذیب و معاشرت، اپنے عادات و خصایل نے جذبات و ماحول کے لحاظ سے یقیناً جداگانہ قانون کی مقتضی ہے۔ لیکن یہ خود مختاری جس انداز سے دی جا رہی ہے، اس کی مثال بالکل ے کہ ہم کسی شخص کو روپیہ کا صندوقچہ تو سپرد کر دیں لیکن کنجی اپنے ہی پاس رکھیں۔

قبل اس کے کہ آپ اس خود مختاری کی حقیقت کو سمجھیں، یہ امر ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ آئین حکومت میں دو جماعتیں بالکل علحدہ ہیں، ایک وہ جو قانون بناتی ہیں اور دوسری وہ جو نظم و نسق کی ذمہ دار ہے، یعنی ایک وہ جسے مجلس آئین ساز کہتے ہیں اور دوسری ے عمال حکومت کہنا چاہئے۔

پس اس صورت میں کسی صوبہ یا ملک کی خود مختاری کا حقیقی مفہوم صرف یہی ہو سکتا ہے کہ قانون بنانے والی جماعت قانون طیار کرے

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۲۷	فروری ۱۹۳۵ء	شمار ۲

ملاحظات

ہندوستان کا جدید نظام سیاست

چونکہ ہمارا ملک ایک جدید آئین حکومت کے زیر اثر آنے والا ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس ماہ کی اشاعت میں اس پر ایک عمومی تبصرہ کرکے قارئین کرام کو اس حقیقت سے آگاہ کردیا جائے۔

اس سے ہندوستان کا ہر فرد آگاہ ہے کہ کانگرس ایک زمانہ سے اس امر کا مطالبہ کررہی ہے کہ ہندوستان کا موجودہ نظام حکومت نہایت قیمتی اور حد درجہ خود غرضانہ ہے اور تاوقتیکہ خود اہل ملک کو ایوان حکومت میں کامل عاملانہ اختیارات نہ دئے جائیں، کوئی اصلاح ممکن نہیں۔ آخرکار بہت چیخ پکار کے بعد حکومت ہند اس بات پر راضی ہوئی کہ ایک کمیشن کی وساطت سے اہل ہند کے مطالبات پر غور کرے۔ چنانچہ سائمن کمیشن کی تشکیل عمل میں آئی اور اس نے ہندوستان کا دورہ کرکے اپنی رپورٹ شائع کی۔ اس کمیشن کے تیور ابتدا ہی سے ایسے تھے کہ آزاد خیال تو خیر کیا اعتدال پسند حضرات نے بھی اس کی طرف سے کسی کامیابی کی توقع نہ پائی اور تقریباً ہندوستان کے ہر گوشہ سے سائمن کمیشن کی مخالفت میں آواز بلند کی گئی۔

اس میں شک نہیں کہ سائمن کمیشن نے اہل ملک کے خیالات کا کافی مطالعہ کر لیا تھا اور اگر وہ دیانت سے کام لیتی تو ملک کے رجحانات کا لحاظ کرکے کوئی مناسب لائحہ عمل پیش کرتی، لیکن افسوس ہے کہ اُس کی کوئی سفارش ایسی نہ تھی جسے یہاں کا کوئی طبقہ قبول کر سکتا۔

یہ زمانہ وہ تھا جب کانگرس کا زور تھا اور ہر طرف سے یہی چیخ پکار سننے میں آتی تھی کہ اگر ملک کو آزادی کامل نہیں مل سکتی تو کم از کم ڈومی نین ہوم رول تو ملنا ہی چاہئے جو برطانیہ کے دیگر مستعمرات کو حاصل ہے۔ اکابر قوم جیلوں میں بند کئے جا رہے تھے، بائکاٹ اور پکٹنگ کے سلسلہ میں روزانہ حکومت اور ارکان کانگرس کے درمیان تصادم کی خبریں آرہی تھیں اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ملک شاید غلامی کی آخری ساعتوں سے گزر رہا ہے۔

حکومت برطانیہ چونکہ جنگ وصلح دونوں زمانوں میں اپنی نرم وگرم پالیسی کبھی نہیں چھوڑتی، اس لئے اس نے اگر ایک طرف قانون کے شکنجہ میں لوگوں کو کسنا شروع کیا تو دوسری طرف گول میز کانفرنس کے انعقاد کی تجویز پیش کر دی۔ اس سے مدعا یہ تھا کہ اہل ملک کی توجہ اس طرف مائل کر دیجائے۔ اور کم از کم کوئی ایک ہی جماعت حکومت کا ساتھ دینے والی پیدا کر لیجائے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ حکمت عملی بہت کامیاب ہوئی اور سارا ملک گول میز کانفرنس کو کامیاب بنانے کا خواب دیکھنے لگا۔ اسکے بعد ایک طرف کانگرس کا زور گھٹ جانے اور دوسری طرف برطانوی کابینہ کی تبدیلی نے ہوا کا رُخ بدل دیا اور گول میز کانفرنس کا نتیجہ قرطاس ابیض کی صورت میں ظاہر ہوا۔

خیال تھا کہ قرطاس ابیض میں جو تجویزیں پیش کی جائیں گی وہ ملک کے ان مطالبات کے موافق ہوں گی جو گول میز کانفرنس میں پیش کئے گئے تھے، لیکن جیسا کہ ابھی ظاہر کیا گیا، کابینہ میں قدامت پسند طبقہ کے اقتدار اور کانگرس کے کمزور پڑ جانے سے تمام اُمیدیں خاک میں ملگئیں اور جس طرح سائمن کمیشن رپورٹ کوئی صحیح چارۂ کار ثابت نہ ہوئی تھی۔ اسی طرح قرطاس ابیض بھی ایک بوسیدہ پارۂ کاغذ سے زیادہ نہ نکلا۔

خیر یہ تو جو کچھ ہوا سو ہوا، لیکن تماشہ تو یہ ہے کہ اب جو پارلیمنٹ کی مشترکہ کمیٹی کی رپورٹ شایع ہوئی ہے، اور جس پر ہندوستان کا آئندہ آئین حکومت قایم ہونے والا ہے۔ وہ قرطاس ابیض سے بھی زیادہ عجیب وغریب ہے اور ہندوستان کے کسی طبقہ نے اس کو نگاہ پسندیدگی سے نہیں دیکھا۔ اس کی سب سے زیادہ اہم واصولی تجویز یہ ہے کہ ہندوستان کے ہر صوبہ کو خود مختار کر دیا جائے، یعنی ہر صوبہ اپنے حالات کے لحاظ سے جو قانون مناسب سمجھے طیار کرے اور جو طریقے اس کی فلاح وبہبود کے لئے موزوں ہوں ان کو عمل میں لائے۔ اس میں شک نہیں کہ اُصولاً یہ تجویز نہایت مناسب ہے، کیونکہ ہندوستان کے مختلف حصوں کی آبادی اپنی تہذیب ومعاشرت، اپنے عادات وخصایل اور اپنے جذبات وماحول کے لحاظ سے یقیناً جداگانہ قانون کی مقتضی ہے۔ لیکن یہ خود مختاری جس انداز سے دی جا رہی ہے، اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ہم کسی شخص کو روپیہ کا صندوقچہ تو سپرد کر دیں لیکن کنجی اپنے ہی پاس رکھیں۔

قبل اس کے کہ آپ اس خود مختاری کی حقیقت کو سمجھیں، یہ امر ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ آئین حکومت میں دو جماعتیں بالکل علحدہ علحدہ ہیں، ایک وہ جو قانون بناتی ہیں اور دوسری وہ جو نظم ونسق کی ذمہ دار ہے، یعنی ایک وہ جسے مجلس آئین ساز کہتے ہیں اور دوسری وہ جسے عمال حکومت کہنا چاہئے۔

پس اس صورت میں کسی صوبہ یا ملک کی خود مختاری کا حقیقی مفہوم صرف یہی ہو سکتا ہے کہ قانون بنانے والی جماعت قانون طیار کرے

اور عمال حکومت بالکل اس قانون کے مطابق عمل کریں لیکن ہندوستان کے صوبوں کی خود مختاری کی صورت یہ ہوگی کہ مجلس آئین ساز قانون تو بناتی رہیگی گر جماعت عال اس قانون کی پابند نہ ہوگی ۔

اس کی توجیہہ مشترکہ کمیٹی کی رپورٹ میں یہ کی جاتی ہے کہ ہندوستان میں چونکہ منظم سیاسی جماعتیں موجود نہیں ہیں اور مجلس آئین ساز میں فرقہ وارانہ نیابت بجائے سیاست کے مذہب کی بنا پر پائی جاتی ہے اس لئے کسی سیاسی رائے عامہ کا پیدا ہونا ممکن نہیں اور قیام امن و سکون یا حفاظت اقلیت کے لئے ضروری ہے کہ یہاں کی جماعت عاملہ مجلس آئین ساز کے سامنے جوابدہ نہ ہو۔

اس میں شک نہیں کہ بظاہر یہ دلیل قرین عقل نظر آتی ہے، لیکن حقیقتاً یہ ایک بڑا سیاسی مغالطہ ہے۔ کیونکہ اول تو فرقہ وارانہ نیابت کی ذہنیت خود حکومت کی پیدا کی ہوئی ہے اور مشترک حق نیابت کو پامال کرکے وجود میں لائی گئی ہے اس لئے یہ کہنا کہ ہندوستان میں مسئلۂ نیابت، مذہبی نقطۂ نظر سے طے کیا جاتا ہے، نہ کہ منظم سیاسی جماعتوں کے اختلاف کی بنا پر کسی طرح درست نہیں، لیکن اگر تھوڑی دیر کے لئے ہم اس کو صحیح باور کر لیں، تو بھی اس حقیقت کو کسی دلیل سے محو نہیں کیا جاسکتا کہ اس وقت ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتیں خواہ ان میں باہمی اختلافِ مذہب کتنا ہی شدید کیوں نہ ہو، اس مطالبہ میں پوری طرح متحد الخیال ہیں کہ ہندوستان کی حکومت ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ہونا چاہئے اور کسی غیر قوم کی حکومت کو صرف اس لئے گوارا کرنا کہ وہ فریق ثالث کی حیثیت سے اُن کے مناقشات دور کرنے کا بڑے سے بڑا معاوضہ حاصل کرتی رہے، ملک کی سخت توہین ہے۔

رہگیا منظم سیاسی جماعتوں کا پیدا ہونا، سو یہ ہمیشہ نتیجہ ہوا کرتا ہے ذمہ دار حکومت کا اور جب تک ہندوستانیوں کو حکومت کے اختیارات کامل نہ مل جائیں ان میں خالص سیاسی جماعتوں کا پیدا ہونا ممکن ہی نہیں ۔۔ الغرض جدید آئین حکومت میں بھی مجلس آئین ساز کی بیکسی و بیدست و پائی بدستور وہی قائم ہے جو اس سے پہلے تھی: البتہ فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ پہلے مجلس آئین ساز میں حکومت کے نمایندوں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی اور اب ملک کے نمایندوں کی کثرت ہے، لیکن اس سے نتیجہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا، کیونکہ حکومت جس چیز کا نام ہے اُسے جو اختیار سیاہ و سفید کا پہلے حاصل تھا اس سے زیادہ اب ملگیا ہے۔

جدید آئین حکومت میں ہر صوبہ کے گورنر کو جو اختیارات عطا ہوئے ہیں وہ اتنے وسیع ہیں کہ مجلس آئین ساز کا وجود بالکل بے معنی ہو کر رہجاتا ہے۔ گورنر کو دو طرح کے اختیارات تفویض کئے گئے ہیں، ایک وہ جنھیں وہ خود اپنی ذاتی رائے سے استعمال کر سکتا ہے اور دوسرے وہ جنھیں اپنے وزرار کے ذریعہ سے بروئے کار لا سکتا ہے ۔۔ ان کی تفصیل بھی سن لیجئے:۔

جہاں تک ذاتی اختیارات کا تعلق ہے گورنر صوبہ میں امن و سکون قایم رکھنے کے لئے جس وقت جو چاہے تدبیر عمل میں لا سکتا ہے، اسی طرح تجارتی تفریق کو روکنے، اقلیتوں کے مفاد کی نگہداشت، سرکاری ملازموں اور ہندوستانی ریاستوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے وہ ایک مستبد حکمراں کی حیثیت رکھتا ہے اور مجلس آئین ساز سے اس کو کوئی سروکار نہیں۔

اب آپ ان اختیارات کا تجزیہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ تمامتر اختیارات گورنر ہی کو حاصل ہیں اور ملک و قوم کی آواز کو کسی اہم معاملہ میں دخل نہیں ۔ تجارتی تفریق کو روکنے کے معنی صرف یہ ہیں کہ اگر برطانیہ و ہندوستان کے باہمی تعلقات تجارت کے سلسلہ میں اگر کبھی برطانوی تجارت

کو کسی قسم کا نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہوگا تو ہندوستانی تجارت کے مفاد کو آسانی سے پامال کیا جاسکیگا۔ قیام امن وسکون کی ذمہ داری نہایت وسیع معنی رکھتی ہے یہاں تک کہ ملک کے جایز مطالبات کے لئے اگر کوئی سیاسی ہنگامہ ہوا تو گورنر اس کو فرو کرنے کے لئے نہ مجلس آئین ساز کی پرواہ کریگا نہ مجلس وزراء کی۔ اس باب میں مجلس وزراء کو بھی بالکل علٰحدہ کر دیا گیا کیونکہ ممکن تھا وہ اہل ملک کے دباؤ یا مروت سے استبداد کو کام میں نہ لاسکتے۔

رہگیا اقلیتوں کا مفاد، سو اس سے مقصود گورنروں کے لئے یہ آسانی بہم پہونچانا ہے کہ وہ جمہور کی آواز کو آسانی سے دبا سکیں۔ اسی قسم کے دو ذرایع سرکاری ملازموں اور ہندوستانی ریاستوں کے حقوق کی حفاظت کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب سرکاری ملازم مجلس آئین ساز یا مجلس وزراء سے بے تعلق رہیں گے تو لامحالہ گورنر کے اشارہ پر چلیں گے اور پبلک کے مفاد سے ان کا احساس بالکل بیگانہ رہیگا۔ اسی طرح ریاستوں کے حقوق کی حفاظت کے سلسلہ میں گورنروں کو موقعہ حاصل ہوگا کہ وہ جمہور کی خواہش کو رد کرسکیں۔

آئین سازی کے سلسلہ میں گورنر کے اختیارات اور زیادہ نامحدود ہیں، یعنی اس کو اختیار حاصل ہوگا کہ ضرورت ومصلحت کے لحاظ سے جو قانون چاہے بنائے، جتنا روپیہ چاہے صرف کرے، جو آرڈیننس مناسب ہو جاری کرے اور مجلس آئین ساز کو معطل کرکے حکومت کا تمام انتظام اپنے ہاتھ میں لیلے۔

الغرض گورنروں کے ذاتی اختیارات پہلے سے بھی زیادہ وسیع ہوگئے ہیں اور دنیائے حکومت کی تاریخ میں سوائے اس جدید آئین کے کوئی دوسری مثال ایسی نہیں ملسکتی جس میں مجلس آئین ساز اور حکومت عاملہ کے درمیان اس درجہ بے اعتمادی وبے تعلقی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔

گورنروں کو علاوہ ذاتی اختیارات کے بعض اختیارات وزراء کی وساطت سے بھی مرحمت ہوئے ہیں یعنی مجلس وزراء کا ہاتھ مجلس آئین ساز میں بھی رہیگا اور اس کے معنی یہ ہیں کہ پبلک کے نمایندوں کو جس حد تک مجلس آئین ساز میں ووٹ دینے کا حق ہے اس کو بھی ضعیف کر دیا جائے تاکہ کوئی تجویز باتفاق آراء پاس نہ ہوسکے۔

صوبجات بنگال، یوپی، بمبئی، اور مدراس میں دو ایوان ہوں گے ایوان ادنیٰ کا نام لجسلیٹو اسمبلی اور ایوان اعلیٰ کا نام لجسلیٹو کونسل ہوگا، اور ان دونوں کو علاوہ مالیات کے برابر کے حقوق حاصل ہوں گے اور اگر بعض مسائل میں دونوں ایوان متفق الرائے نہ ہوں گے تو ان کا مشترک اجلاس کیا جائے گا اور کثرت آراء سے فیصلہ ہوگا۔ بظاہر یہ تجویز بہت خوشنما معلوم ہوتی ہے، لیکن اس کا راز یہ ہے کہ ایوان اعلیٰ کے ممبر چونکہ دولت مند طبقہ کے نامزد کئے ہوئے ہوں گے، اس لئے ظاہر ہے کہ اس ایوان میں قدامت پسند ورجعت پسند لوگوں کی تعداد زیادہ ہوگی اور اس طرح گویا گورنر کا ہاتھ اور زیادہ مضبوط ہوجائے گا۔

اب مرکزی حکومت پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔ اول اول کمیشن کی رائے یہ تھی کہ مرکزی حکومت کو بڑی حد تک غیر ذمہ دار رکھا جائے اور یہ صرف اس لئے کہ ہندوستانیوں کو کوئی موقعہ حکومت میں دخل دینے کا نہ ملے۔ لیکن بعد کو مشترکہ کمیٹی نے یہ سفارش منظور نہیں کی، کیونکہ اول تو ریاستوں نے اعتراض کیا کہ جب تک مرکزی حکومت ذمہ دارانہ ہو وہ وفاق میں شامل نہیں ہوسکتیں، دوسرا سبب یہ تھا کہ اگر مرکزی حکومت غیر ذمہ دار

ہو گی تو مجلس آئین ساز کے مقابلہ میں اس کی کوئی قوت باقی نہ رہیگی، اس لئے اب یہ صورت تجویز کی گئی ہے کہ محکمۂ خارجہ اور دفاع براہ راست گورنر جنرل کے اختیار میں دیدئے جائیں اور باقی تمام اُمور کی ذمہ داری وزراء کے سپرد کر دیجائے، لیکن شرط یہ ہے کہ جن اُمور میں گورنر جنرل کو خصوصی اختیارات سیاہ و سپید کے حاصل ہیں، ان پر کوئی حرف نہ آئے۔

اُمور خارجہ پر گورنر جنرل کے اختیارات کے معنی یہ ہیں کہ حکومت ہند خود براہ راست نہ کسی دوسرے ملک سے کوئی معاہدہ کر سکتی ہے اور نہ بین الاقوامی سیاسیات میں حصہ لے سکتی ہے، بلکہ یہ تمام باتیں حکومت برطانیہ سے متعلق ہوں گی۔ بہ الفاظ دیگر اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کی کوئی علٰحدہ ہستی سیاسیات میں شمار نہیں ہو سکتی بلکہ وہ صرف تاج برطانیہ کا ایک ایسا ماتحت حصہ ہے جسے علٰحدہ کوئی مستقل ہستی نہیں مل سکتی۔

ہندوستان کی حفاظت و دفاع میں صرف گورنر جنرل کو ذمہ دار قرار دیا جانا محض اس لئے ہے کہ ہندوستانیوں کو نہ فوج میں زیادہ درخور پانے کا موقع مل سکے اور نہ فن حرب کے اُصول سے ان کو آگاہی حاصل ہو۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ اس وقت اگر انگریز ہندوستان سے چلے جائیں اور کوئی غنیم اس پر حملہ آور ہو تو ہندوستان مدافعت نہیں کر سکتا کیونکہ نہ وہ فنون جنگ سے واقف ہے اور نہ آلات حرب طیار کر سکتا ہے، لیکن اس عذر کی بنا پر کسی ملک کو ہمیشہ کے لئے اس فن سے بیگانہ رکھنا اور اُس کو کبھی اس بات کا موقع نہ دینا کہ وہ ملک کی حفاظت کا اہل بن سکے کتنا غیر روادارانہ بلکہ غیر منصفانہ طرز عمل ہے۔

مالیات کا انتظام ہر چند مرکزی وزراء کے سپرد ہوگا، لیکن چونکہ اصل ذمہ داری گورنر جنرل کی ہے اس لئے وہ بجٹ میں مداخلت کر کے جس تجویز کو رد کرنا چاہے فوراً مسترد کر سکتا ہے۔

مرکزی حکومت میں دو ایوان ہوں گے، ایک کونسل آف اسٹیٹ کے نام سے، دوسرا ہاؤس آف اسمبلی کے لقب سے۔ اول الذکر ایوان کے ارکان ۲۶۰ تک ہوں گے جن میں ۱۵۰ ملک کے نمایندے ہوں گے ۱۰۰ ریاستوں کے اور ۱۰ گورنر جنرل کے نامزد کئے ہوئے۔ دوسرے ایوان کے ارکان کی تعداد ۳۷۵ تک ہوگی جن میں ۲۵۰ ملک کے نمایندے اور ۱۲۵ ریاستوں کے۔

چونکہ ان دونوں ایوانوں میں ایک بڑی تعداد ریاستوں کے نمایندوں کی ہوگی اور یہ نمایندے وہاں کی پبلک کے منتخب کئے ہوئے نہ ہوں گے بلکہ ریاستوں کے نامزد کردہ ہوں گے، اس لئے ظاہر ہے کہ انھیں برطانوی ہند کے معاملات سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے اور وہ حکومت کی رائے کے خلاف کبھی برطانوی ہند کی رعایا کا خیال نہ کریں گے۔

ان دونوں ایوانوں کو برابر کے اختیار حاصل ہوں گے اور اختلاف رائے کی صورت میں دونوں کا مشترکہ اجلاس ہوگا اور کثرت رائے سے جو فیصلہ ہوگا اس پر عمل کیا جائے گا، لیکن اس مشترکہ جلسے کے معنے یہ ہوں گے کہ اکثریت رجعت پسندوں کی ہو جائے گی، کیونکہ کونسل آف اسٹیٹ کے تمام اراکین صوبوں کے ایوان اعلیٰ کے منتخب کئے ہوئے ہوں گے اور مشترکہ اجلاس میں ان کی اور ریاستوں کے نمایندوں کی تعداد ملکر نصف سے زیادہ ہو جائے گی۔

الغرض مختصراً یہ ہے وہ جدید آئین حکومت جو ہندوستان کو ملنے والا ہے اور یہ ہیں وہ آزادیاں جو ملک و اہل ملک کو یہاں کے نظم و نسق میں عطا ہوئی ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ بعض حضرات ان جملہ ناکامیوں کا ذمہ دار برطانیہ کی پالیسی اور یہاں کے قدامت پسند طبقہ کو

قرار دیتے ہیں، لیکن سیاسیات کے باب میں میرا مسلک ہمیشہ آزاد رہا ہے اور میں اس کو بالکل خلاف فطرت نہیں سمجھتا اگر برطانیہ اپنے مفاد کے لئے ہندوستان کی خواہشوں کو پامال کر دینا چاہتا ہے، کیونکہ وہ یہاں درس اخلاق و روحانیت دینے نہیں آیا بلکہ اپنی قوم اور اپنے ملک کو فائدہ پہونچانے کی نئی راہیں نکالنے کے لئے آیا ہے اور اس سے زیادہ احمق کوئی نہیں ہو سکتا اگر وہ ہندوستان کے مفاد پر اپنے مفاد کو قربان کر دے۔ اس لئے حکومت کو مورد الزام ٹھہرانا نہایت لایعنی بات ہے، اور ان تمام ناکامیوں و مایوسیوں کا سبب خود ہمیں اپنے اندر تلاش کرنا چاہئے۔

دنیا میں کوئی قوم اس وقت تک نہیں ابھر سکتی، جب تک وہ خود اپنے اندر تغیر پیدا نہ کرے اور احساس آزادی کا ثبوت بجائے زبان کے اپنے افعال و کردار سے نہ دے۔

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان میں آزادی کا احساس بڑی حد تک پیدا ہو گیا ہے، لیکن مصیبت یہ ہے کہ یہاں کی سیاسیات کا قیام زیادہ تر مذہبی جذبات پر ہے اور وطنیت کا رشتہ کوئی چیز نہیں سمجھا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ شروع سے اس وقت تک کوئی متفقہ آواز اہل ملک کی بلند نہ ہو سکی اور حکومت نے ہمیشہ اسی اختلاف کی آڑ پکڑ کر ملک کی آزادی کو اسقدر تعویق میں ڈالا۔ اور نہیں کہا جا سکتا کہ کب تک ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ اسی طرح معلق رہیگا۔

گزشتہ ماہ کا رسالہ

افسوس ہے کہ جنوری ۳۵ء کے رسالہ میں ملاحظات کے لئے جگہ نہ نکل سکی اور مجھے بالکل اسکا موقعہ نہ ملا کہ اس بزم ادب میں شریک ہونے والوں کا شکریہ ادا کرتا۔

جس وقت اول اول میں نے اس کا اعلان کیا تو مجھے توقع تھی کہ مضامین کثرت سے اور اچھے موصول ہوں گے۔ سو جس حد تک کثرت کا تعلق ہے اس میں تو مجھے مایوسی نہیں ہوئی لیکن جہاں تک "اچھے" ہونے کا سوال ہے یقیناً میری توقعات پوری نہیں ہوئیں اور بہت سے مضامین مجھے نظر انداز کرنا پڑے۔

۲۳۶ صفحات میں علاوہ میرے مضامین کے جو ۱۱۶ صفحات پر حاوی ہیں، ۱۲۰ صفحات دیگر حضرات کے ہیں اور اس طرح گویا نصف بار میرے احباب نے اُٹھایا جس کا میں ازبس شکر گزار ہوں۔

مقامی احباب میں سب سے زیادہ مدد مجھے مسٹر مشیر احمد صاحب علوی بی اے سے ملی، جنھوں نے نہ صرف یہ کہ خود ایک گرانقدر مقالہ تحریر فرمانے کی زحمت گوارا فرمائی، بلکہ مولوی امیر احمد صاحب علوی اور مولوی نور الحسن صاحب نیر سے بھی دو نہایت پاکیزہ مضمون حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ علاوہ اس کے جو اخلاقی اعانت انھوں نے کی ہے، اس کا اظہار چنداں ضروری نہیں، لیکن اعتراف لازم ہے۔

میں مرزا جعفر علی خانصاحب اثر کا بھی زیر بار کرم ہوں کہ سب سے پہلے انھوں ہی نے مضمون بھیجنے میں اقدام کیا اور ایک ایسے بحث کو پیش کیا جو دلچسپ بھی ہے اور مفید بھی۔ اسی طرح جناب مولوی نصیر الدین ہاشمی، جناب سید تمکین کاظمی، جناب افسر میرٹھی اور حضرت سیماب اکبر آبادی کا بھی شکریہ مجھ پر لازم ہے کہ انھوں نے میری التجا کو قبول فرمایا اور اس ادبی صحبت میں شرکت کی زحمت گوارا فرمائی۔

جناب ناطق لکھنوی کا میں خصوصیت کے ساتھ ممنون ہوں کیونکہ اگر وہ اپنی نظم "تخلیقِ اُردو" مرحمت نہ فرماتے تو رسالہ غالباً نظم کے لحاظ سے بالکل معرا نظر آتا۔ جناب ناطق نے اس نظم میں جس خوبی و پاکیزگی سے اُردو شاعری کی تاریخ پر تبصرہ فرمایا ہے وہ ارباب نظر سے مخفی نہیں۔

صوبۂ بہار کی شاعری پر عزیز محترم مولوی عبدالمالک صاحب آروی نے جو کچھ لکھا ہے وہ انھیں کا حصہ تھا، ان کا شکریہ میں اس لئے ادا نہیں کرتا کہ خود انہے مضمونوں پر میں نے اپنا شکریہ کب ادا کیا ہے۔

جنوری ۱۹۳۶ء کا نگار

یہ بات تقریباً طے ہو چکی ہے کہ جنوری ۱۹۳۶ء کا نگار ہندی شاعری کے لئے وقف ہو اور اگر ناظرین کرام گوارا فرمائیں تو بجائے لیتھو کے ٹائپ میں شایع کیا جائے۔

عرصہ ہوا ہندی شاعری پر میری ایک کتاب "جذبات بھاشا" کے نام سے شایع ہو چکی ہے، لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ مجھے اس زبان پر عبور حاصل ہے درست نہیں، لگاؤ ضرور ہے اور بہت ہے، لیکن اس خدمت کو میں تنہا کبھی انجام نہیں دے سکتا اگر برادران وطن میری اعانت نہ فرمائیں۔ ارادہ ہے کہ اس سلسلہ میں پریاگ، کاشی اور اجودھیا کا سفر کر کے اس زبان کے ماہرین سے تبادلۂ خیال کروں اور اس زبان کے جتنے رتن میسر آسکتے ہیں وہ سب پیش کر دوں۔

مسلمانوں میں اس زبان پر ماہرانہ عبور رکھنے والے بہت کم ہیں، لیکن یہ جانتا ہوں کہ اس سے لطف اٹھانے والوں کی کمی نہیں، اسلئے میں بہت ممنون ہونگا اگر ارباب قلم و اہل نظر اس باب میں اپنے علم و مشورہ سے میری اعانت فرمائیں گے۔ میں جن عنوانات پر مضامین چاہتا ہوں ان میں سے خاص خاص یہ ہیں:-

(۱) ہندی شاعری کی تاریخ — (۲) ہندی شاعری کے مختلف ادوار اور ہر دور کے بہترین شعراء کے کلام کا انتخاب اور ان پر تنقید۔ (۳) ہندی شاعری کا اثر اُردو شاعری پر — (۴) اُردو شاعری کا اثر ہندی شاعری پر — (۵) مسلمان فرمانرواؤں نے ہندی شاعری کی ترقی میں کیا حصہ لیا — (۶) ہندی شاعری کی عروض — (۷) ہندی شاعری کے مختلف اصناف اور ان کے تدریجی ارتقاء کی تاریخ — الغرض یہ اور اسی قسم کے بہت سے عنوانات قایم ہو سکتے ہیں جن پر کامل تحقیق و استقصاء کے ساتھ لکھنے کی ضرورت ہے اور غالباً ایک سال کی فرصت اس کے لئے ناکافی نہ ہوگی۔

مختصر تاریخ عالم

اس کتاب میں نوع انسانی کے ظہور، اس کی تدریجی ترقی اور عہد قبل تاریخ کے متعلق (بقول اڈیٹر نگار) نہایت مفید معلومات فراہم کی گئی ہیں اور اُردو میں کوئی کتاب اس مقصد کو سامنے رکھ کر اس خوبی سے مرتب نہیں کی گئی۔ زبان کی سلاست، ترجمۂ اصطلاحات، انداز بیان کی دلچسپی اور ماخذ کی تحقیق و تفتیش اس تالیف کی نمایاں خصوصیات میں ہیں۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول سید نعیم احمد۔ باون پائگاہ لشکر (ریاست گوالیار)

اشو[1] زردشت

اس کرۂ ارض کے اور ملکوں کی طرح فارس کا آدم زاد بھی شروع میں اس توہم پرستی کا شکار تھا جو نابالغ دماغوں کی خو ہے۔ سحر و جادو ارواح اور عجائب پرستی کے ساتھ چاند سورج اور قدرت کی دوسری روشن و نمایاں مخلوق کی پرستش مصریوں، بابلیوں اور ہندوؤں کی طرح ایرانیوں میں بھی جاری و ساری تھی ان قوتوں کے علاوہ ان کے اور بھی اپنے من گڑھت دیوتا تھے جن کو وہ مختلف صورتوں اور شکلوں میں پوجتے تھے۔ وہاں کے پیشدادیوں[2] کے وقت میں ملک میں ایک وبا آئی[3] اور بکثرت موتیں ہوئیں عزیزوں اور رفیقوں کی مفارقت سوہان روح تھی۔ اُنھیں ہمہ وقت پیش نظر رکھنے کے لئے زندوں نے مردوں کے مجسمے[4] بنائے اور ان کی منزلت کرنے لگے۔ یہ منزلت ترقی پاکر پرستش ہوگئی اور آخر اُن کی عبادت ہونے لگی۔ پھر مختلف عناصر کے مجسمے بنے اور باضابطہ طور پر ان کے آگے بھی سر جھکنے لگے۔ یوں وہاں بُت پرستی کی بنیاد پڑی اور قوم کی قوم اس میں مبتلا ہوگئی۔ ان ہی پیشدادیوں میں مشہور ہوشنگ ہے۔ چقماق (چکمک پتھری) کی رگڑ سے آگ اسی کے وقت میں نکلی اور وہ عجیب سمجھ کر نور خدا مانی اور سمجھی گئی۔ تہمورس[5] اس کے خلف کے زمانہ میں شیراسپ ایک عقیل و فرزانہ پیدا ہوا۔ اس نے نہ صرف سلطنتی اُمور میں بادشاہ کو مدد دی بلکہ فنِ کتابت ایجاد کرکے ایرانیوں کو تعلیم بھی دینے لگا۔ جمشید اس تہمورس کا بھتیجا اور جانشین ہے۔ یہ وہی جمشید ہے جس کا جام ایرانیوں ہی کی محفل عیش میں نہیں بلکہ ہماری بزم ادب میں بھی ابتک گردش کر رہا ہے۔ اس کے زمانہ تک بُت پرستی اتنی ترقی پاگئی اور اس کی اہمیت اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ جمشید کو اپنے پرستش کئے جانے کی بھی ہوس ہوئی اور آخر وہ بھی ایک قوت تسلیم کرکے دیوتا بلکہ خدا کی طرح مانا جانے لگا۔ پیشدادیوں کے زوال پر کیانی ایران کے حکمران بنے اور جیسا کہ اوپر کہا جاچکا انھیں کے وقت میں زرتشت کا ظہور ہوا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ بیرونی حملوں اور خصوصاً تورانیوں کی زیادتیوں سے ملک تاراج ہو رہا اور پھر شاہ پرستی کے زور سے رعایا تباہ اور مخلوق خدا سخت عذاب میں مبتلا ہو رہی ہے۔

دنیا کی تاریخ بتاتی ہے کہ جب کسی ملک و قوم پر ایسا کڑا وقت آتا ہے تو ان میں ہمیشہ ایک ایسا بندۂ خدا پیدا ہوتا ہے جسکے قوائے عقلی اسوقت کی ذہنیت سے بالاتر ہوتے ہیں۔ یہ "مردِ غیب" اپنے زمانہ کی حالت پر غور کرتا اور ملک و قوم کی حالت سدھارنے کے لئے آخر کوئی دوا تجویز کرتا ہے۔ یہ قانونِ قدرت ہے اور اس قانون سے اسوقت کا ایران مستثنیٰ کیونکر ہو سکتا تھا؟ کہتے ہیں کہ شاہ ایران کی نسل[5] اور

---

[1] پہلوی زبان میں اشو حضرت کے ہم معنی ہے۔ [2] ایران کے اول حکمران۔ [3] گبن اور سفرنامہ مشرق دیار، از ولیم وی رو برکراس ۱۸۵۳ء۔ [4] یہ ٹھیٹھ فارسی لفظ خواہ مخواہ عربی بنا اور حرف ث اس میں داخل کیا گیا۔ [5] بندہش کتاب دعائے پارسیان و مسعودی۔

بہرام شاہ اول اس گھر کا وہ مشہور شہر یار ہے جس کے عہد میں حکیم مانی کی نشوونما ہوئی۔ یہ صورت پرست زردشت سے یزداں پرست کے مذہب کی شکل بگاڑنا چاہتا تھا اس لئے شاہی عتاب میں آیا اور قتل ہوا۔ یہ واقعہ ۲۷۶ء کا ہے جس کے بعد دوسو برس تک زمین ایران کسی قابل ذکر مذہبی انقلاب کا شکار نہوئی۔ لیکن قباد پسر فیروز کے زمانہ میں اس مذہبی سکون میں پھر ایک ہیجان آیا۔ مزدک نام ایک مرد اٹھا۔ اس نے اپنا ایک نیا مسلک پیش کیا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ دنیا کا مالک خدا ہے، اور ہم سب اُس کی ملکیت ہیں۔ یہاں کی کوئی چیز سوائے اس ذات کے دوسرے کی نہیں ہو سکتی۔ اسمیں سب کی شرکت ہے اور اس میں سب کا برابر کا حصہ۔ یہاں تک کہ مردوں کی بیبیاں بھی ہم میں مشترک اور دوسروں کے تصرف میں آسکتی ہیں۔ یہ عقیدہ عام ہوا اور ہر طرح کے تصرفات شروع ہوگئے۔ ملک میں انارکی اور بدامنی پھیلی۔ حکومت اس فتنہ کو دور کر سکتی تھی لیکن شاہ وقت یعنی قباد خود مزدک کا مرید ہوگیا۔ اس لئے یہ عقیدہ اور قوی ہوگیا۔ مزدک نے ایک دن بادشاہ قباد سے اُس کی ملکہ (مادر نوشیرواں) کو طلب کیا کہ اس کا وہ بھی حصہ دار و حقدار ہے قباد اس طلب کو رد نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن نوشیرواں نے بمنت اپنی ماں یعنی ملکہ کو اس ذلت سے بچایا اور جب سے وہ (نوشیرواں) مزدک اور اُس کے پیرؤں کے پیچھے پڑگیا۔ قباد کے بعد جب نوشیرواں تخت جم پر بیٹھا تو ملک کے اصلی و قومی مذہب (زردشتی) کا نئے سرے شادیانہ بجایا لیکن اس عرصہ میں مزدکی ایران میں پھیل کر قوی ہو چکے تھے، ان کا استیصال آسان نہ تھا بادشاہ کچھ دن خموش رہا آخر ایک دن مزدک پنجہ میں آیا اور نوشیروانی عدل نے ۵۳۱ء میں اُس کا فیصلہ کر دیا۔

سمجھنا چاہئے کہ وجود میں آئی ہوئی کوئی چیز فنا نہیں ہوتی۔ ہم محسوس نہ کرسکیں مگر وہ کسی نہ کسی صورت میں موجود رہتی ہے یہی حالت خیالات و عقائد کی بھی ہے مزدک گو بظاہر فنا ہوا مگر وہ اور اس کے عقائد فضائے ایران کو گھیرے رہے اور اس کے سو برس بعد ہی وہ عراق میں نمودار ہوئے جنگ صفین کے خوارج نے بھی یہی مزدکی عقیدہ پیش کیا اور الملک اللہ کا نعرہ مار کر اور مسلمانوں کے عقیدہ سے گریزاں ہو کر اپنا علم علحدہ بلند کرنے لگے ان عجمی و عراقی یعنی مزدکی عقائد نے نہ صرف ساسانیوں اور مذہب زردشت کو کمزور کیا بلکہ تیسری چوتھی صدی ہجری کے مسلمانوں کے عقائد میں بھی تلاطم ڈالا اور وہ مختلف صورتوں میں ظاہر ہوا کیا ہے۔ نوشیرواں کے بعد ایران چین سے نہ رہا۔ ہرمز سوم اور بہرام کی حکومتیں ملک کے ان وزرا و امرا کے زیر اثر تھیں جو اپنے رسوخ و قوت کے لئے آپسمیں جنگ کرتے اور تخت جمشید پر اپنے مطلب و اغراض کے شہزادوں کو بٹھاتے و اُٹھاتے تھے۔ خسرو پرویز بھی اسی طرح تخت نشین ہوا۔ اس کا زمانہ ہند کے آخر مغل بادشاہوں کے مشابہ ہے سلطنت کمزور رعایا منتشر اور فوج ابتر تھی ملکی و قومی مذہب (زردشتی) بھی شہ زور نہ تھا اور ظاہری ٹھاٹھ کے سوا ملک میں اور کچھ باقی نہ تھا۔ شیریں اسی خسرو کی وہ محبوب نگین ہے جو فرہاد سے منسوب ہو کر مشہور ہوئی اور ہمارے ادب کی زبان پر اب بھی چڑھی ہوئی مزا دے رہی ہے۔ پوران دخت و شاہنشاہ اور آرزم دخت ملکہ و شاہ شطرنج تھے ان کے بعد یزدگرد شاہ ایران بنا۔ یہ اپنے پیشروؤں سے بھی زیادہ کمزور و بے خبر نکلا۔ فارسیوں پر تازیوں کا تسلط اسی کے وقت میں ہوا۔ ضحاک کے بعد ایران اب دوبارہ عربوں کے ہاتھ آیا۔ قدیم قومی خاق تازہ ہوا اور ساسانیوں کا یوں خاتمہ ہوگیا۔

ساتویں صدی عیسوی تک موسوی مذہب ختم عیسوی مسخ اور ہندی و زردشتی بے سود ہو چکا اور خدائے واحد کی پرستش نابود نہیں تو مردہ ہو چکی اور دنیا انتشار و ہیجان میں تھی اس لئے قانون قدرت کے موافق پھر ایک ایسے راہبر کی ضرورت تھی جس کی بلند آواز دنیا کو چونکائے اور کسی ایک ہستی کی طرف مخلوق کی گردنوں کو جھکائے۔ قدرت کی یہ عادت ایسی ضرورت کے وقت تازہ ہوئی اور اب کہ یہ صدا اس جگہ سے اُٹھی جہاں

اس وقت سے صدیوں قبل خلیل کی تکبیر فضلائے عالم میں گونج چکی تھی۔ اسی ساتویں صدی عیسوی میں ہمارے پیغمبر عرب کا ظہور ہوا وہ وہی احکام و فرمان لائے جو ان سے قبل دنیا میں آچکے مگر فراموش ہو چکے تھے۔ آپ نے اس حکم خدا اور اپنے آنے کی خبر صرف اپنے ملک و قوم ہی کو نہیں دیا بلکہ دنیا کے مختلف ممالک و اقوام کو بھی دعوت بھیجی کہ وہ بخبری کا عذر کر کے پارنہ ہو جائیں۔ یہ پیام جس طرح موسویوں اور عیسائیوں تک گیا اسی طرح مجوسیوں زردشتیوں تک بھی پہونچایا گیا۔ عجم عرب کا ڈانڈا ہے اور ایک کا دوسرے پر اثر مدت سے چلا آتا ہے۔ اس لئے عجمی زمین پر بھی بہت جلد وہ آسمانی تحفہ بطور پاسخ بھیجا گیا۔ یہ خسرو پرویز کا زمانہ ہے۔ شاہ عجم عرب کی کسی ادا کا دلدادہ نہیں وہ ایسے پیغام و پاسخ کو بھی اپنی قدیم قومی نظر تنفر سے دیکھتا اور ٹال جاتا ہے۔

رسول عربی کا مقصد پیامبری تھا نہ کہ جنگجوئی۔ اس لئے انھوں نے عجم تک اپنا پیغام پہونچا دینے کے بعد وہاں کی زمین پر قبضہ اور عجم پر غلبہ کی نہ کبھی خود خواہش کی اور نہ اپنے بعد کے لئے ایسی فرمائش کر گئے۔ آنحضرت کے بعد جو ملک گیریاں ہوئیں وہ اسلامی فتوحات کے نام سے مشہور ہیں مگر حقیقتاً وہ عربی فتوحات تھے نہ کہ اسلامی! اُسوقت عراق کا وہ حصہ، جو عرب سے ملحق تھا عجمی اثر میں تھا اس لئے فارسیوں اور تازیوں کا تصادم لازمی تھا۔ کوششیں کی گئیں کہ اختلاف نہ ہو۔ عجمی اپنے قوم کی قدامت و شوکت پر نازاں بلکہ مغرور تھے عربوں کی سی قوم کی طرف کیا مخاطب ہوتے۔ اس غفلت کا نتیجہ اختلاف تھا اور اختلاف کا نتیجہ تصادم اور وہ ہو کر رہا۔ آخر تازی و فارسی میدان میں آگئے اور انکی سیاسی جنگ شروع ہو گئی۔

سنہ ۱۱ھ کے بعد ہی یہ اختلاف ہوا لیکن حق یہ ہے کہ عربی اسلامیوں نے اس معاملہ میں بھی بڑی طرحیں دیں۔ وہ چاہتے تھے کہ شاہ عجم اور ان کے درمیان وہ سلوک و مدارات قائم ہو جائیں جو دوسرے صاحب کتاب بادشاہوں کے ساتھ قائم ہو چکے تھے۔ اس خیال سے سنہ ۱۴ھ میں یزدگرد کے پاس ایک اسلامی وفد گیا اس کے سردار شیخ مغیرہ نے شاہ وقت سے مودت و مصالحت چاہی مگر وہ منظور نہ ہوئی۔ آخر نوبت بہ جنگ رسید۔ عجمی پسپا ہوئے اور چارسو سال کی ساسانی حکومت اور ہزارہا برس کی فارسی سلطنت پامال ہو کر تازیوں کے دست تصرف میں آگئی۔

پیغمبر عربی نے عجمیوں کو ہمیشہ بہ نظر لطف دیکھا۔ نوشیرواں عادل کے عہد میں اپنے وجود ذیجود پر آپ نے فخر فرمایا اور فارسیوں کو اپنی محفل و مجلس میں سرفراز کیا ہے۔ اور سلمان فارسی کا قصہ کسے معلوم نہیں کہ ان کے سے عجمی غلام کو آپ نے آقائے اعراب ہی نہیں بنایا بلکہ انھیں من اہلبیتی فرماکر اپنے گھر میں داخل کر لیا۔ یہ وہی مذاق و اثر تھا کہ اہلِ بیت رسول میں فارسیوں کی ہمیشہ قدر رہی اور فارسی جنگوں کے بعد جب شاہزادی ساسانیان حضرت شہر بانو مدینہ لائی گئیں تو جناب امیر کے تدبّر و قدردانی سے وہ شہزادۂ عرب جناب امام حسین کے محل میں ملکہ و مالکہ بنکر رہیں۔ رسول عربی کی نسل ان شہر بانوں کی جہت سے چلی اور پھیلی اور آج دنیا میں لاکھوں سادات عرب و عجم کے اس اتفاق سے ہماری زمین پر نظر آتے اور فخر کرتے ہیں۔ اور کیا خوب کہا ہے ڈاکٹر گیگر (جرمن) نے کہ "علی کے اس تدبر نے قدیم عربی و عجمی نفاق ہی کو کم نہیں کیا بلکہ ایک ملک کے ملک اور قوم کی قوم کو بغیر جنگ زیر کر کے ہمیشہ کے لئے انھیں اپنا اور اپنے گھر کا غلام بنالیا۔

عجمی و عربی مذہب میں حقیقتاً بال[۱] برابر کا فرق تھا۔ اشو زردشت بھی غیب سے وہی لائے جو ان سے پہلے دنیا کو اسی ذریعہ سے مل چکا تھا۔ اس آریا معلم عجم کا حکیم جاماسپ نام (ندیم شاہ گشتاسپ) ایک شاگرد رشید تھا اس حکیم وقت نے بطور پیشینگوئی گشتاسپ سے کہدیا تھا کہ عرب میں آئندہ ایک رسول کا ظہور ہوگا اور اس کا دین و آئین دنیا کو مسخر کرلیگا ؎

بہ گشتاسپ جاماسپ خود گفتہ بود ازایں رازو ایں راہ او رفتہ بود (شاہنامہ ورزینۃ التواریخ)

مجوسیوں پر اس پیشین گوئی کا اُس زمانہ سے اثر تھا اور وہ "ایک آنے والے" اور یہودیوں کے فارقلیط کے سے "محمود" محمدؐ کے منتظر تھے۔ عجمیوں کے دل و دماغ سے وہ خیال نہ گیا اور آخر نوشیرواں ؎

چناں دید روشن روانش بہ خواب کہ در شب بر آمد یکے آفتاب

---

[۱] مذہب اسلام اور کیش زردشت واقعی اس درجہ ملتے جلتے ہوئے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے ہمارے آنحضرت پر ان کے خاندان میں سب سے اول امیر مومنان حضرت علیؑ ایمان لائے اسی طرح اشو زردشت کی تصدیق پہلے ان کے چچازاد بھائی نریو آہ سنے کی۔ آنحضرت نے دشمنوں کے خوف سے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ زردشت بھی اسی طرح بان دیج (مقامے در ایران) سے باختر جاتے اور وہاں تبلیغ کرتے ہیں۔ لارہبانیت فی الاسلام ہمارا قانون ہے۔ اور زردشت کا بھی یہی آئین۔ قیامت کے قریب ہم بھی ایک مہدی وہادی کے آنے کا اعتقاد رکھتے ہیں اور زردشتی اس موقع پر شوشیان نام ایک بزرگ کے ظاہر ہونے کی پیشین گوئی کرتے ہیں۔ زردشتیوں کے یہاں قیامت میں جس پُل پر سے گزرنا ہوگا اس کا پہلوی نام چناوت ہے اور عربی میں (اُس کا معرب) صراط۔ ان کی ہماری رسمیں بھی اکثر ایک ہیں۔ شام کو چراغ دکھائی دیا اور ہم نے دعا پڑھی۔ زردشتیوں کے سامنے آتش نمودار ہوئی اور اُنھوں نے حمد کے لئے ہاتھ اُٹھائے۔ ہمارے ان کے مذہبی مراسم بھی دور نہیں ہیں۔ ہم نماز کے لئے وضو کرتے ہیں وہ بھی اپنی عبادت سے پہلے منہ ہاتھ دھوتے اور مسح پا کرتے ہیں۔ ہماری نماز پنجوقتہ ہے اور ان کی عبادت بھی دن میں پانچ مرتبہ۔ اسے دیکھ کر اکثر ارباب دانش کا خیال ہے کہ ہماری پنجوقتہ نماز زردشتیوں کی تقلید ہے ورنہ اسلام میں وہ صرف تین دفعہ فرض تھی۔ موجودہ ایران کے صوبہ کرمان شاہ میں بہت سے آثار اور صنادید عجم ہیں ان میں تخت بوستان یعنی گلزار ایوان نامی ایک عمارت بھی ہے اس میں چند مجسمے وہاں کے قدیم بادشاہوں کے بھی ہیں اور ایک اسٹیچو اشو زردشت کا بھی ہے ان سنگی تصویروں پر پہلوی زبان میں کچھ کندہ ہے یہ فرانس کے مشہور مستشرق اور پہلوی زبان کے عالم میسو سلوسٹر دے سیسی نے ان عبارتوں کو حل کیا ہے۔ شاہ پور کے مجسمے پر یہ تحریر ہے:- "یہ تصویر خدا پرست شہنشاہ شاہ پور بادشاہ ایران (ایران) و انران- ایرن کی ہے۔" بادشاہ بھی اپنے باپ دادا کی طرح ایک بندۂ خدا اور یزدان پرست تھا اور اس کا خاندان آسمانی و بہشتی کہا جاتا ہے۔ وہی عالم کہتا ہے کہ آر کے معنی پہلوی میں مومن کے ہیں ایرن اس کی جمع ہے یعنی مومنین اور آن کے معنی کافر کے ہیں ان ایرن کفار یعنی شاہ پور مومنوں اور کافروں دونوں کا بادشاہ تھا۔ اس لئے ایران (جمع آر) کے معنی مومنستان (جائے مومنین) کے ہیں یعنی وہاں صرف خدا پرست بستے تھے۔ بیرونی مثل ترک و تاتار انیران یعنی کفار تھے۔ شاہ پور ان دونوں کا حکمراں تھا (تاریخ ایران از مرجان ملکم کا ضمیمہ صفحہ ۵۲۴) یہ وہ شہادتیں ہیں جن سے شاہان ایران اور ایرانیوں کا موحد و خدا پرست اور مومن ہونا ثابت ہوتا ہے

چہل مایۂ نردباں از برش — کہ می رفت تا اوجِ کیواں سرش
برآمد بر ایں نردباں از حجاز — خراماں خراماں بہ کشی و ناز
جہاں قاف تا قاف پر نور کرد — بہ ہر جا کہ بد ماتمی سور کرد

بادشاہ یہ خواب دیکھ کر چونکا تو تعبیر دانوں سے اس نے اس کی حقیقت پوچھی اسوقت کے ایک فرزانہ بزرجمہر نے تعبیر دی کہ سے

ازیں روز تا در چہل سال و بیش — نہد مردے از تازیاں پائے پیش
کہ در پیش گیرد رہ راستی — بہ پیچد ز ہر کژی و کاستی

حکیم جاماسپ کی اس قدیم پیشین گوئی پر نوشیرواں کا یہ خواب ایک زبردست اضافہ ہوا۔ عجمی چونکے اور اس "منتظر" کے انتظار میں تھے کہ پیغمبر عرب اسی نوشیرواں کے مبارک عہد میں پیدا ہوئے۔ زردشتی پیغمبری و رسالت کو خود خوب سمجھتے تھے۔ نوشیرواں کے بعد جب آنحضرت کے ظہور کا چرچا ہوا تو مجوسی اگلی پیشین گوئی اور شاہی خواب کو یاد کر کے رسول عربی کا خیال کرنے لگے۔ یہ دین عجم گیا تو عجمیوں کو اپنے لا الٰہ اللہ کے بعد محمد رسول اللہ کا کہدینا کیا دشوار تھا۔ اُنھوں نے بے تکلف اس دوسرے کلمہ کو بھی یاد کیا اور عربی مسلمانوں سے ملنے لگے۔ اس لئے عربوں کو اپنے مذہب کے معاملہ میں مجوسیوں سے وہ مقابلہ کرنا پڑا جو مشرکوں سے پیش آیا۔ لیکن عقائد کے توحد کے لئے ہمیشہ یہ ضرور نہیں کہ دو (ایک سے) کلمہ گویوں کی قومی یا خاندانی جنگ بھی دور ہو جائے۔ بنی امیہ و بنی عباس کبھی نہیں ملے۔ دونوں عرب تھے اور دونوں مسلمان۔ مگر ان کا نفاق اسلامی تاریخ کا ایک خونی باب ہے۔ اس لئے عرب و عجم کی وہ قومی منافرت کیونکر دور ہو سکتی تھی جو ضحاک کے وقت سے ان دونوں قوم کے دلوں میں گھر کر چکی تھی۔ فارسی ضحاک اور ضحاکیوں کو اپنے ملک و قوم کا تاراج کنندہ جانتے تھے اور اس لئے وہ ضحاکیوں کے ساتھ جملہ عربوں کو اپنا عدو سمجھتے اور ان سے حد کی نفرت کرتے تھے۔ یہ تقاضائے فطرت ہے اس میں مذہب اور برادری کو دخل نہیں۔ عرب بھی عجمیوں سے کچھ کم متنفر نہ تھے۔ عراق عرصہ سے فارسیوں کے قبضہ میں تھا وہ عربوں کو ستاتے اور انھیں زیر رکھنا چاہتے تھے اس لئے مسلمان ہونے پر بھی ان دو قوموں کا دلی اتفاق جلد ممکن نہ تھا جو مجوسی بلا جبر و اکراہ محمد رسول اللہ کہنے پر آمادہ ہو گئے عرب اُن سے کسی طرح کا تعرض نہ کر سکتے تھے۔ مگر جنھوں نے ذرا تامل کیا وہ اصول اسلام کے برخلاف فوراً تشہیر کیا گیا اور یہ اسی نفاق کا نتیجہ تھا جو عرب و عجم میں صدیوں سے چلا آتا تھا۔ ان فاتحین کے قبضہ میں جو فارسی جلد نہ آسکے وہ اپنے مرکز سے قہستان جا کر سو سال وہاں مقیم رہے پھر ہرمز پہونچے اور پچاس سال وہاں گزارے اور بعد کو یعنی ۷۳۶ء میں ہندوستان آکر گجرات میں اپنے گھر بنا کر رہ گئے وہاں کے راجہ جے رانا نے اُنھیں پناہ دی اور شرط کی گجراتی زبان[1] و عادات سیکھیں اور رہیں۔ جب سے یہ جلا وطن پردیس میں پڑے ہوئے اپنے ملک کو یاد کرتے اور اپنی قدیم مذہبیت و معاشرت کو غیر ملک میں قائم رکھے ہوئے ہیں۔ یہ قوم اکثر لحاظ سے قابل ستائش ہے اس نے بیشک اسلام کو قبول کر لیا کہ وہ ایک ناقابل انکار اور مطابق فطرت مذہب تھا وہ مسلمان ہوئے لیکن عربوں کے عادات و خصائل کو اختیار نہ کر سکے۔ اس لئے کہ وہ ان کی تہذیب و معاشرت سے اگر پست نہیں تو حد کے بیگانہ تھے۔ پھر یہ کہ انھوں نے کسی حال اپنی زبان نہیں دی۔ عربی فارسی پر گو دو سو برس مسلط رہی مگر آخر اس کا فارسیوں نے اپنے کندھے سے اس لئے اُتارا کہ عرب اپنی زبان کے بل پر انھیں بھی عجم یعنی گونگا

[1] قصہ سنجان از کیقباد نوساری سنہ ۱۶۰۰ء

کہتے تھے۔ ایک غیور قوم ایسی توہین کس طرح برداشت کرسکتی تھی۔ اُنھوں نے اپنی قدیم وسیر زبان کو پھر اُبھارا اور عربی کو پس پشت ڈال دیا۔ ہاں وہ مفتوح ہوئے لیکن یونانیوں کی طرح وہ بھی اپنے فاتحین کے دل و دماغ پر حاوی ہوگئے۔ اُنھوں نے یونان پر قبضہ کیا مگر وہ یونانیوں کو زیر کرسکے بلکہ ان کے قوائے دماغی سے دب گئے۔ ایران میں بھی یہی ہوا۔ عرب اس پر قابض ہوئے مگر ایرانیوں کی ذہنیت اور اُن کی تہذیب و معاشرت سے ہمیشہ متاثر بلکہ اس سے آلودہ رہے۔ شروع میں عام طور پر اس کا اظہار نہ ہوسکا مگر بنی امیہ کے اخیر زمانہ اور عباسیوں کے ابتدائی عہد میں سب کھل گیا۔ ہارون اور امین و مامون عرب باقی نہ رہے تھے بلکہ اچھے خاصے ایرانی تھے۔ مامون کی ماں تک فارسی تھی۔ شاہی محل اور خلیفہ کے دربار کی تہذیب و معاشرت ایرانی اور کسرائی ہوگئی تھی۔ برمکی کون تھے اور طاہر و یعقوب لیث حجازی و عراقی تھے کہ ایرانی و خراسانی اور ان کی ذہنیت تازی تھی یا فارسی؟ تاریخ سے نابلد جو چاہے کہدیں مگر جو آنکھیں رکھتا ہے وہ بے تامل یہ کہدے گا کہ سنہ ۲۰۰ھ کے بعد عرب، عرب ہو باقی نہ رہے تھے۔ بلکہ ایک طرف وہ شامیوں رومیوں اور یونانیوں کے مرید تھے تو دوسری طرف ایرانیوں کے شاگرد رشید اور اسوجہ سے دوسری صدی ہجری سے عراقیوں، ساسانیوں، دیلمیوں اور غزنویوں بلکہ خوارزمیوں، سنجریوں، چنگیزیوں، مغلوں، اور صفویوں کے وقت تک کی بیشتر تصنیفات خواہ نثر ہوں یا نظم اور وہ مذہبی ہوں یا غیر مذہبی حجازی خیالات سے کم اور ایرانی جذبات سے زیادہ متاثر نظر آتی ہیں!۔ یہ فارسی (پارسی) بیشک تعداد میں کم ہوگئے لیکن اپنے قوائے ذہنی میں دیگر عظیم قوموں سے اب بھی قوی تر ہیں۔ سر ولیم ہنٹر اپنی تاریخ ہند میں اور سر ہربرٹ کوٹن اپنی نیو انڈیا (ہند نو) میں اس جماعت کو "Wonderful" یعنی "عجیب" لقب دیکر ہندوستان میں ان کی کارگزاریوں اُن کے فنون اور اُن کی صنعت و حرفت کے ثناخوان ہیں۔ یہ قوم اگر اپنے ملک میں رہتی اور قومی تنفر کے باعث اسے پامال کرنے اور اس کے اخراج کی فکر نہ کی جاتی تو آج ایران یونان و یورپ نظر آتا اور ایشیا وامریکہ پر بھی چشمک زن ہوتا۔ لیکن افسوس اور سخت افسوس ہے کہ براعظم ایشیا تو خیر، ہندوستان اور ایران تک اُن سے کماحقہ واقف نہیں۔

مسلمان جن کا مذہب زردشتیوں کو بہ آسانی اپنی آغوش میں لے سکتا تھا وہ تک اُن سے غافل رہے اور ہیں۔ اس غفلت بلکہ منافرت کے اسباب میں سے بڑا سبب وہ تازی و فارسی تنفر بھی ہے جو ایک عرصہ سے ان دونوں قوموں میں چلا آتا اور ایک کو دوسرے کی طرف بڑھنے نہیں دیتا ہے۔ مشہور اور قابل لحاظ مسلمان مورخین[1] نے گو اس قوم کو موحد خدا پرست پابند مذہب اور آئین دوست بتایا ہے مگر ہم نے انہیں آتش پرست اور مشرک سمجھ لیا اور مشرکین سے بھی زیادہ اُن سے کنارہ کرلیا۔ دوسری طرف مسلمانوں سے اُن کی خود علیحدگی ہے۔ اس ملک میں وہ اپنے غیروں سے بے تپاک ملتے ہیں مگر یہاں کے مسلمانوں سے دور رہتے اور اُنھیں اپنا بنانے میں گریز کرتے ہیں حالانکہ اسلام سے قریب تر اگر کوئی مذہب ہے تو زردشتی۔ اور زردشتی مسلک سے نزدیک تر کوئی مشرب ہے تو اسلام۔ اس لیئے ان دونوں کو آگے بڑھنا اور ملنا اور جلد معانقہ کرلینا چاہیئے۔

(نواب) نصیر حسین خاں خیالؔ (مرحوم)

(نگار) یہ مقالہ نواب نصیر حسین خاں خیالؔ کا اب سے دو ماہ قبل اُسوقت موصول ہوا تھا جب وہ بقید حیات تھے اور شایع اُسوقت ہورہا ہے۔ جب وہ ہم میں نہیں ہیں۔ یہ مضمون حقیقتاً پروفیسر رضوی کی کتاب "Parsis" پر ریویو کی حیثیت رکھتا ہے۔

[1] مثل طبری، زمخشری، شہرستانی اور مسعودی و بیرونی۔

نواب صاحب مرحوم نہایت وسیع المطالعہ انسان تھے اور تحقیقی مضامین لکھنے میں ان کو خاص ملکہ حاصل تھا جس کا علم سب سے پہلے غالباً ۱۹۱۶ء کی اُردو کانفرنس میں ہوا جب انھوں نے کانفرنس کے صدر ہونے کی حیثیت سے اپنا بے مثل خطبۂ صدارت زبان اُردو کی تدریجی ترقی پر سنایا۔

نواب خیالؔ کی موت اس میں شک نہیں کہ ہمارے علمی حلقوں کے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان ہے جسکو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

حال ہی میں داستانِ اُردو کے نام سے وہ ایک نہایت بسیط و جامع تصنیف مرتب فرما رہے تھے، جس کا ایک باب مغل اور اُردو کے نام سے شائع بھی ہوچکا ہے۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ یہ کتاب مکمل ہوچکی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہم اُس جماعت سے جس کے پاس یہ مسودہ موجود ہے درخواست کریں گے کہ جلد سے جلد اسے شائع کردے۔

مرحوم نے شاہنامہ پر بھی ایک بسیط ریویو اُردو میں لکھا تھا جسے سید ظہیر احمد صاحب پٹنہ سے کتابی صورت میں شائع کررہے ہیں بہرحال اب کہ مرحوم کے علمی فیوض سے ہم محروم ہوچکے ہیں، ایک یہی تدبیر باقی رہگئی ہے کہ اُن کے تمام افادات کو یکجا کردیا جائے اور اُن کو تلف ہونے سے بچا لیا جائے۔

آج نہیں

آپ کو کل معلوم ہوگا کہ جنوری ۱۹۳۵ء کا نگار جو اُردو شاعری پر ایک جامع تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے، کتنی قیمتی چیز ہے۔

نگار کے مومن نمبر و ظفر نمبر کے لئے روزانہ خطوط موصول ہوتے ہیں، لیکن اب وہ کسی قیمت پر نہیں مل سکتے۔ چند دن کے بعد بالکل یہی حال جنوری ۳۵ء کے نگار کا ہوگا کہ آپ اس کی ضرورت کو محسوس کریں گے، لیکن نہ پاسکیں گے۔ پھر، کیا اس سے زیادہ ارزاں اور فایدہ کا سودا کوئی اور ہوسکتا ہے کہ صرف پانچ روپیہ میں آپ دو روپیہ کا ایک پرچہ بھی حاصل کریں اور سال بھر تک نگار بھی دیکھتے رہیں۔

جنوری ۳۶ء کا رسالہ اس سے زیادہ ضخیم شایع ہوگا اور ہندی شاعری کے لئے وقف ہوگا اس لئے وہ حضرات جن کا چندہ ۳۵ء میں ختم ہو رہا ہے، وہ اسے نوٹ کرلیں کہ خریداری قائم رکھنے کی صورت میں یہ نمبر ان کو مفت ہاتھ آئے گا، ورنہ یوں ان کو تین روپیہ ادا کرنے پڑیں گے۔

منیجر نگار لکھنؤ

ایک افسانہ جو مکمل نہ ہو سکا

(۱)

میں ایک افسانہ نگار ہوں۔

جب کبھی مجھے بخار آتا ہے تو میرے ذہن میں غیر معمولی تیزی و شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے۔

میں اسوقت کی حالت کو کچھ اس طرح بیان کر سکتا ہوں:-

شدت کے ساتھ بخار چڑھا ہوا ہے، جسم پھُن رہا ہے، رضائی اوڑھے پڑا ہوں، رات کی گہری خاموشی ہر طرف چھائی ہوئی ہے، سب سو رہے ہیں، میں جاگ رہا ہوں، صرف جاگ ہی نہیں رہا ہوں ایک ناقابل بیان عذاب میں مبتلا ہوں، دماغ ایک ایسی مشین کی طرح کام کر رہا ہے جس کو انجام سے بے پرواہ ہو کر پوری رفتار کے ساتھ چلا دیا گیا ہو، کوشش کرتا ہوں کہ یہ شدید ذہنی مصروفیت ختم ہو جائے اور میں تھوڑی دیر کے لئے آرام کی نیند سو رہوں، لیکن خیالات کی یورش کسی طرح ختم نہیں ہوتی، یہ سیلاب برابر بڑھتا چلا آتا ہے، کبھی ایک خیالی اسٹیج پر پہونچکر تقریر کرنے لگتا ہوں، اور اگرچہ اپنی زندگی میں کبھی کسی قابل ذکر مجمع کے سامنے تقریر کرنے کی جرأت نہ کر سکا لیکن بخار کی حالت میں رضائی میں منھ لپیٹ کر اس طرح بے تکان بولتا ہوں کہ بڑے سے بڑا خطیب اگر سن پائے تو رشک کرنے پر مجبور ہو جائے، پُرجوش اور ہیجان خیز ملفوظات کا دریا بہا دیتا ہوں، میرے جملوں میں کوئل کی پیہم کوک یا ایک کامل الفن مطرب کی تانوں کی کیفیت پائی جاتی ہے، ایک فقرہ دوسرے فقرے کی اس طرح پیروی کرتا ہے جس طرح موسلا دھار بارش میں ایک بوند دوسری بوند کی، اور الفاظ کی پاکیزگی کو صرف موتیوں کی نزہت سے تشبیہ دیجا سکتی ہے، جب یہ بے پناہ تقریر کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آتی تو میں، گھبرا کر رضائی سے منھ نکالتا ہوں اور تقریر کو دماغ سے علحدہ کرنے کے لئے اپنے آپ کو جھنجھوڑتا ہوں، چند منٹ سکون رہتا ہے۔ لیکن اُس کے بعد کسی ہنگامی موضوع پر شعر کہنے لگتا ہوں، اور باوجود اس امر کے کہ میں شاعر نہیں ہوں اور عمر بھر میں مشکل سے تین چار مصرعے موزوں کر سکا ہوں، ایسی کامیاب نظم لکھتا ہوں کہ جو صرف ایک کہنہ مشق اور حقیقی شاعر ہی کا حصہ ہو سکتی ہے۔ نظم کا مفہوم مسلسل ہوتا ہے اور بے حد طویل ہوتی ہے۔ مختلف اشعار ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہوتے ہیں جس طرح کسی عمارت کی ایک اینٹ دوسری اینٹ سے۔ نظم ابھی مکمل نہیں ہونے پاتی کہ گھنٹے کی ٹن ٹن مجھے بیدار کر دیتی ہے اور میرے دماغ کو شاعری کے اثر سے آزاد کر دیتی ہے۔ میں مضطرب ہو کر کروٹ بدلتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر یہی کیفیت رہی تو صبح تک میرا کیا حال ہوگا۔ لیکن زیادہ وقت گزرنے نہیں پاتا کہ ایک افسانہ لکھنے میں مصروف ہو جاتا ہوں۔ اُس وقت مجھے افسانے کا پلاٹ سوچنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ذہن بیک وقت قصے کے واقعات بھی تیار کرتا ہے اور اُن کو الفاظ کا جامہ بھی پہناتا ہے۔ میں نے

آج تک جس قدر افسانے لکھے ہیں اُن کی خصوصیت یہ ہے کہ زبان بے حد سلیس و رواں ہوتی ہے، گویا ایک ندی ہے جو گنگناتی ہوئی خراماں خراماں چلی جارہی ہے۔ افسانے کا موضوع بھی سکون آمیز ہوتا ہے۔ یعنی کیا بلحاظ زبان اور کیا باعتبارِ موضوع، میں کسی طرح کا جوش پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ میرے افسانے ہنگامہ پرور نہیں ہوتے۔ زندگی کے خاموش اور پرسکون مناظر کی ترجمانی کرتا ہوں۔ ہیجانی چیزوں کی طرف اس لئے توجہ نہیں کرتا کہ اپنی طبیعت اور فطرت کے لحاظ سے اُن کو پیش کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ لیکن یہ افسانہ جو بخار کی حالت میں میرا ذہن تیار کرتا ہے یکسر ہنگامہ خیز ہوتا ہے۔ زبان اور موضوع دونوں جوش سے لبریز ہوتے ہیں۔ اس افسانے کی نوعیت اُس سمندر کی سی ہوتی ہے جو ایک زبردست طوفان سے ہم آغوش ہو۔ جب افسانے کی یہ کیفیت نقطۂ کمال کو پہونچ جاتی ہے تو میں بیزار ہو کر کروٹیں بدلنے لگتا ہوں۔ غزل کے بعد پھر نظم کی باری آتی ہے اور نظم کے بعد پھر افسانے کی۔ اور یہ چکر یونہی قائم رہتا ہے۔ شاعری، خطابت اور افسانہ نویسی کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزیں ذہن کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں اور خیالاتِ پریشاں کا سیلاب ایک مہیب بلا کی طرح قریب قریب رات بھر میرے دماغ پر مسلط رہتا ہے۔

صبح ہوتے ہوتے بخار اُتر جاتا ہے اور یہ جنونی کیفیت ختم ہو جاتی ہے۔ رات کی دماغی پیداوار پر غور کرتا ہوں۔ تقریباً سب کچھ بھول چکا ہوتا ہوں۔ کیا مجال جو کسی تقریر کا کوئی فقرہ یا کسی نظم کا کوئی مصرع بھی یاد آجائے۔ لیکن ہاں ایک آدھ افسانہ تھوڑا بہت دماغ میں محفوظ ہوتا ہے۔ پلاٹ سب کا سب یاد ہوتا ہے۔ رہی زبان اور اندازِ بیان، یہ چیزیں مجھے اپنی دسترس سے باہر معلوم ہوتی ہیں۔ میں خیال کرتا ہوں کہ میں کبھی رات کی طوفانی کیفیت ہیں پیدا نہیں کر سکتا۔ بہر حال دن میں کسی وقت قلم، دوات اور کاغذ لیکر بیٹھتا ہوں اور افسانہ لکھنا شروع کرتا ہوں۔ میری کوشش اور خواہش یہ ہوتی ہے کہ زبان میں وہی حرارت اور وہی جوش پیدا کروں جو رات موجود تھا۔ موضوع کی نوعیت میری مدد کرتی ہے اور کامیابی کے آثار نظر آتے ہیں۔ محسوس کرتا ہوں کہ جو بات پیدا کرنی چاہتا تھا وہ پیدا ہو رہی ہے۔ مقصد حاصل ہو رہا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مجھے بخار چڑھنے لگتا ہے اور میں قلم کو ہاتھ سے رکھدینے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔

(۲)

رات مجھے بخار آگیا تھا۔ غالباً موسم کی تبدیلی کا نتیجہ تھا۔ شام کے وقت چڑھا اور نصف شب تک اُتر گیا۔ رات کے آٹھ نو بجے سے بارہ ایک بجے تک وہی کیفیت تھی جو اوپر بیان کر چکا ہوں۔ اس دوران میں میں نے دھواں دھار تقریریں بھی کیں، طوفانی جذبات سے لبریز نظمیں اور افسانے بھی لکھے، مذہب، سرمایہ داری اور استعماریت پر مقالے بھی رقم کئے، ماموں جان کو شکایتوں اور دھمکیوں سے لبریز ایک طویل خط بھی لکھا۔ اور نہیں کہہ سکتا کہ کیا کیا کیا۔

اب سہ پہر کا وقت ہے۔ وہ کمزوری جو بخار سے پیدا ہو گئی تھی رفع ہو چکی ہے۔ کوشش کرتا ہوں کہ رات کے افسانوں میں سے ایک افسانہ لکھوں۔ لیکن صرف پلاٹ رات کا ہوگا، زبان وغیرہ وہی ہو گی جو عام طور پر لکھتا ہوں۔ کسی قسم کا جوشش پیدا کرنے کی کوشش نہیں کروں گا۔

(۳)

اللہ! ملازمت بھی کتنی بڑی مصیبت ہے! رات کے دس بجے ہیں، برسات کا موسم ہے، شام سے مینہ کی جھڑی لگی ہوئی ہے، گلیاں

اور کوچے سنسان پڑے ہیں، زمانے بھر کے کاروبار بند ہیں، دنیا تعطل اور فارغ البالی کے گہوارے میں آرام کر رہی ہے، — لیکن میں ہوں کہ سفر کی تیاریاں کر رہا ہوں۔

میرا گھر ہسپتال کا نمونہ بنا ہوا ہے، قریب قریب ہر شخص بیمار ہے۔ ایسے وقت میں میرا مکان پر موجود ہونا نہایت ضروری ہے۔ لیکن سرکاری ضرورتیں میری ضرورتوں پر مقدم ہیں۔ میرا سفر ایسا کام ہے جس کو ملتوی نہیں کیا جاسکتا، ایسی نماز ہے جس کو قضا کر کے نہیں پڑھا جاسکتا۔ میں مکان چھوڑ کر چلے جانے پر مجبور ہوں۔

خدایا! یہ جدوجہد، یہ کشمکش، یہ مستقل عذاب، کیا زندگی اسی کا نام ہے؟ کیا زندگی میں سچی راحت معدوم ہے؟ راحت مصیبتیں جھیلے بغیر نہیں مل سکتی؟ کیوں نہیں مل سکتی؟ آخر ایسا کیوں ہے؟ اس میں کیا مصلحت ہے؟ کیا راز ہے؟

یہ جذبات تھے جن کو اپنے سینے میں لیکر میں گھر سے روانہ ہو رہا تھا۔ چلتے وقت شفیق اور حمید نے اسٹیشن تک ساتھ دینے کی آمادگی ظاہر کی۔ لیکن میں نے انھیں یہ کہکر روک دیا کہ بھئی برسات کا زمانہ ہے، تم کہیں بارہ بجے تک واپس ہوسکو گے، مفت پریشان نہو، میں اکیلا چلا جاؤں گا، تم آرام کرو۔ میں نے سامان یکّے پر رکھوایا اور روانہ ہوگیا۔ سڑک بالکل ویران تھی۔ کوئی راہگیر نظر نہ آتا تھا، گہرا سکوت ہر طرف طاری تھا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر لالٹینیں جل رہی تھیں جن کی مدھم روشنی اردگرد کی تاریکی میں اضافہ کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ ہر طرف سیاہی ہی سیاہی تھی۔ زمین، فضا، آسمان، ہر چیز سیاہ تھی۔ ویرانی، خاموشی اور سیاہی کے امتزاج سے دنیا پر ایک ایسی کیفیت طاری تھی جس کو الفاظ بیان نہیں کر سکتے۔ میرا یکّہ اس تاریکی کو چیرتا ہوا، اس جمود کو توڑتا ہوا اسٹیشن کی طرف چلا جا رہا تھا۔ میں عجیب کیفیت سے ہم آغوش تھا۔ میرے دلمیں غم اور مسرت کے ملے جلے جذبات موجزن تھے۔ قدرت کے معصوم اور سنجیدہ مناظر سے لطف اندوز ہونے کی فطری صلاحیت مجھ میں موجود ہے۔ چنانچہ اسٹیشن پہونچتے پہونچتے میں گھر کے مادی افکار سے بہت بلند ہو چکا تھا، میری رجائیت میرے قنوط پر غالب آرہی تھی، اور میرے دلمیں لطیف احساسات بیدار ہو رہے تھے۔

اسٹیشن پہونچا تو وہاں بھی زیادہ اژدہام نہ تھا۔ گاڑی کے آنے میں دیر تھی۔ اس لئے اسٹیشن جس کا شور و شغف ضرب المثل ہے نسبتاً خاموش تھا اور باہر کی وسیع پرسکون دنیا سے ہم آہنگی کا اعلان کر رہا تھا۔ مسافر خانے میں دو تین سادھو ستار کے ساتھ نغمہ سرائی کر رہے تھے۔ اور رات کی رنگینی میں اضافہ کر رہے تھے۔ میں بہت دیر تک دلچسپی کے ساتھ اُن کا گانا سنتا رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میری طبیعت کی اُداسی بالکل دور ہوگئی اور جذبات و محسوسات کا وہ صحیح توازن مجھے حاصل ہوگیا جس کے ذریعہ میں دنیا کی ہر چیز کو خوشی اور مسرت کا سرچشمہ خیال کرتا ہوں۔

مسافر خانے میں میں نے یہ بھی دیکھا کہ ایک نسبتاً تاریک گوشے میں چند عورتیں سفید ساریاں پہنے ہوئے بیٹھی ہیں۔ اندھیرے کے باعث اُن کے چہرے نظر نہیں آرہے تھے۔ اس لئے مجھے خبر نہ ہوئی کہ یہاں کوئی ایسی چیز بھی ہے جس کی قیمت کم سے کم میری زندگی ہوسکتی ہے جب گاڑی کے آنے کا وقت قریب آیا تو قلی نے میرا سامان پلیٹ فارم پر لاکر رکھا۔ اتفاق سے (بعض اوقات اتفاقات بھی کیسے جان لیوا ثابت ہوتے ہیں) اُن ملبوس والی عورتوں کا سامان بھی وہیں لاکر رکھا گیا جہاں میں اپنے سامان کے ساتھ موجود تھا۔ اور تھوڑی دیر میں

وہ خود بھی وہیں آکر بیٹھیں۔

پلیٹ فارم پر گیس کے ہنڈے روشن تھے۔ لوگوں کے خدوخال آسانی کے ساتھ دیکھے جاسکتے تھے۔ میں نے اُس کو دیکھا۔ صرف اُسکی ایک جھلک دیکھی۔ اس طرح کہ آیندہ کے لئے کچھ دیکھنے کی خواہش دل میں باقی نہ رہی۔

حسین اور نوجوان عورتیں اکثر دیکھنے میں آتی ہیں، میں دیکھتا ہوں، تھوڑی دیر متاثر رہتا ہوں اور پھر بھول جاتا ہوں۔ یہاں بھی غالباً یہی ہوتا۔ لیکن ظالم قدرت میری بربادی پر تُلی ہوئی تھی۔ اُس کی سفاک بزم میں میری ہلاکت کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ میں برسات کی اُس مست و جوال رات کو، اُس پُرکیف موسم کو، اُس بھیگی ہوئی خنک فضا کو، درویشوں کے اُس معصوم نغمے کو، اور آہ ایک پیکرِ حسن و شباب کی اُس ہوشربا جھلک کو یاد کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اللہ! کیا یہ چیزیں میری دنیا کو زیروزبر کر دینے کے لئے کم تھیں، میری زندگی کے نظام کو تہ و بالا کر ڈالنے کے لئے ناکافی تھیں۔ پھر کیا ضروری تھا کہ جب ریل آئے اور میں ایک ڈبّے میں بیٹھوں تو وہ عورتیں بھی مع اُس پیکرِ حسن و شباب کے اُسی ڈبّے میں آکر بیٹھیں لیکن جیسا کہ میں نے ابھی کہا قدرت میری تباہی پر آمادہ تھی، اُس نے طے کر لیا تھا کہ یہ رات، یہ قاتل رات، میری زندگی کی رنگین ترین اور خونیں ترین رات ثابت ہو۔

آہ! کیا لکھوں، کس طرح لکھوں، کیونکر بیان کروں، الفاظ ساتھ نہیں دیتے۔ میں ڈبّے کے ایک گوشے میں بیٹھا ہوا ہوں اور نگار (میں نے اُس کا نام نگار رکھ دیا تھا) بیچ میں، بجلی کے قمقمے کے بالکل نیچے۔ اُس کے حُسن کی تابانی کا یہ عالم ہے کہ دیکھنے والا نہیں کہہ سکتا کہ برقی لیمپ کی روشنی اُس پر پڑ رہی ہے یا اُس کی روشنی برقی لیمپ پر۔ اُس کے خدوخال میں ایک بانکپن پایا جاتا ہے، ایسا تیکھا پن جس کو صرف ایک چابک دست مصور کا موقلم پیش کر سکتا ہے۔ اُس کی بھووں کے کھچاؤ کو میں نہیں سمجھ سکتا کس طرح بیان کروں، اُس کی آنکھوں کی خنجریت کے لئے کونسی نادر تشبیہ ڈھونڈ کر لاؤں۔ اُس کی پلکیں لانبی ہیں اور سیاہ، اس قدر سیاہ کہ اُن کے سائے میں آنکھیں بغیر سُرمے کے سُرگیں معلوم ہوتی ہیں۔ وہ جب نظریں اُٹھاتی ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ ایک سوئی ہوئی دنیا جاگ اُٹھی، ایک پُرخروش میکدے کے دروازے کُھل گئے۔ جب اُس کی پلکیں جُھک جاتی ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک مضطرب اور بے قرار دنیا نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ ایک طوفان خیز سمندر میں یک لخت سکون ہو گیا۔ اُس کی رنگت کی سرخی میں سفیدی کی جھلک نہیں، سبزی کی جھلک ہے، گویا ایک ہلکے سبز رنگ کے شیشے میں گہرے سرخ رنگ کی شراب بھر دی گئی ہے۔ وہ ایک پیکرِ ناز ہے، مجسمۂ لطافت ہے، نزاکت کی تصویر ہے، شعریت اور موسیقی سے لبریز ایک نظم ہے، فردوس کی حوروں کا دلآویز نغمہ ہے، جوانی کی شراب کا چھلکتا ہوا جام ہے، نشے اور مستی میں ڈوبی ہوئی ایک انگڑائی ہے، نسوانی پیرہن میں ایک برقپارہ ہے، اُس کے وجود میں زندگی کی ساری حلاوتیں جمع ہو گئی ہیں، موسمِ بہار کی تمام شگفتگیاں اور شادابیاں سمٹ کر آگئیں ہیں۔

میں معمولی شکل و صورت کا انسان ہوں، حسنِ ظاہری سے مجھے کوئی حصہ نہیں ملا۔ لیکن یہ زمانہ میرے شباب کا زمانہ ہے اور یہ ایک حقیقت ہے جس کے اظہار میں مجھے ذرا باک نہیں کہ میں صنفِ نازک کے لئے اپنے اندر ایک بے پناہ کشش رکھتا ہوں۔ جب میں اپنی زندگی کے رومانی واقعات پر غور کرتا ہوں تو مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے کبھی کسی حسین و نوجوان عورت کو لائقِ توجہ سمجھا ہو اور اُس نے مجھ سے اعتنا نہ کیا ہو، میں نے اُسے ایک دفعہ نگاہ بھر کر دیکھا ہو اور وہ مجھے بار بار دیکھنے پر مجبور نہ ہو گئی ہو۔ آپ اس کو خودستائی پر محمول کریں گے لیکن

میں اس کو اپنی سب سے بڑی بدبختی خیال کرتا ہوں کہ یہی چیز میری بربادی کا باعث ہوئی ہے اور اسی نے میرے دل میں رنج و حسرت کے ناسور ڈال دئے ہیں۔

میں نے نگار کو بھی دیکھا اور ایسی نظروں سے دیکھا جن میں میری روح کی تمام آرزوئیں، تمام پرستارانہ جذبات کھنچ آئے تھے۔ پھر نگار نے مجھے دیکھا اور اُن نظروں سے دیکھا جو دل میں اُتر کر نشتر بن جاتی ہیں اور چٹکیوں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ یہ سلسلہ کچھ دیر قائم رہا۔

اس کے بعد نگار نے بہت جلد اپنی نگاہوں میں ایک والہانہ انداز پیدا کر لیا۔ اُس کی نظریں میری نظروں کا بے معنی جواب ہونے کی بجائے کسی پیغام کی حامل بن گئیں، اُس کی آنکھیں باتیں کرنے کی کوشش کرنے لگیں، وہ ایک آئینہ بن گئیں جس میں اُس کی محبت صاف جھلکتی ہوئی نظر آنے لگی۔

آہ! کسی کو دیکھنا، محبت بھری نگاہوں سے دیکھنا ایک بہت دلچسپ مشغلہ ہے۔ لیکن جب دوسری جانب سے بھی اُن محبت بھری نگاہوں کا جواب محبت بھری نگاہوں ہی کی شکل میں ملنے لگتا ہے تو یہ مشغلہ دلچسپی کی حدوں سے گزر کر کسی دوسری منزل میں پہونچ جاتا ہے، اُس منزل میں جہاں زندگی کی کوئی قیمت باقی نہیں رہتی، جہاں سر وبالِ دوش ہو جاتا ہے، جہاں جنون و دیوانگی کی حکومت ہے، جہاں عشق کی خونچکانیوں کی فرمانروائی ہے۔

وہ مجھے دیکھتی رہی، اپنی قاتل نگاہوں سے دیکھتی رہی، میرے دل پر کسی زہر میں بجھے ہوئے تیر برساتی رہی یہاں تک کہ میں دنیا، اُسکی خواہشات اُس کے آلام، اُس کے افکار، اُس کی مصروفیات، اُس کی ہر چیز سے بالکل غافل ہو گیا۔ میں محسوس کرنے لگا کہ میں کسی مقتل میں پہونچ گیا ہوں، میرا تمام وجود زخموں سے چور ہو گیا ہے، لیکن ان زخموں میں ایک ناقابل بیان کیف ہے، ایک ایسی لذت ہے جس کے اظہار سے زبان قاصر ہے۔

اس کے بعد نگار نے ایک نئی شوخی سے کام لیا۔ وہ غالبًا اس شغل میں زیادہ دلچسپی پیدا کرنا چاہتی تھی۔ اسوقت تک وہ بالکل میرے مقابل بیٹھی تھی لیکن اب اپنی جگہ سے اُٹھ کر اپنے سامنے کی سیٹ پر آ گئی اور اپنی ساتھ والیوں سے ہم دوش ہو کر بیٹھ گئی، گویا اب اُس کی پشت میری طرف تھی، اور وہ مجھ سے قریب تر تھی، اِس جگہ پہونچکر اُس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنی ساری کے دامن کو اجازت دیدی کہ اُس کا سرا ڈھلک کر نیچے گر جائے اور اُس کے حسین اور سیاہ بالوں کو جو بظاہر نہایت تکلف کے ساتھ گوندھے گئے تھے بے نقاب کر دے۔ ظاہر ہے کہ میں اس ہوشربا نظارے کی تاب نہ لا سکتا تھا۔ بے قرار ہو گیا، تڑپ اُٹھا، دل میں بجلیاں بھر گئیں۔ پھر نگار نے پیچھے مڑ کر مجھے دیکھا اور مجھے دیکھتے ہوئے۔ میری نظروں سے نظریں ملاتے ہوئے۔ اپنی ساری کے دامن کو دوبارہ سر پر رکھ لیا۔ اُسوقت گویا اُس کی نگاہیں مجھ سے کہہ رہی تھیں "تم میرے حسین چہرے کی بانکی خصوصیات سے بہت متاثر ہوئے ہو لیکن میرے بال بھی کچھ کم خوبصورت نہیں ہیں۔ یہ اتنے لانبے ہیں کہ جب میں ان کو کھول دیتی ہوں تو اپنی پیٹھ پر ایک بوجھ سا محسوس کرتی ہوں۔ ان کی دمک آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔ اور تم نے دیکھا میں نے کس قدر تکلف سے ان کی آرائش کی ہے، کیسی محنت سے ان کو گوندھ کر گردن کے پچھلے حصے پر حلقوں کی شکل میں قایم کیا ہے، تم نے اس ہوشربا نظارے کو دیکھا؟"

اس طرح نگار نے کئی مرتبہ اپنے سر کو برہنہ کیا، اور ہر مرتبہ سر کو ڈھانکتے وقت پیچھے مڑ کر مجھے دیکھا۔ اُس کے دیکھنے کا انداز بھی عجیب تھا۔ میرے برابر ایک مرد مع ایک عورت کے بیٹھا تھا، نگار مڑ کر پہلے اُس عورت کو دیکھتی تھی، اُس کے بعد ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ مجھ پر ڈال کر اپنی

نگاہوں کو واپس لے جاتی تھی۔ شاید نگاہِ غلط انداز اسی کو کہتے ہیں۔

ہم گاڑی میں گیارہ بجے کے قریب سوار ہوئے تھے، اب ایک بجا تھا۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے کہ انسانی دماغ ہر نوع کی مصروفیت سے آزاد ہوجانا چاہتا ہے اور انسان کو سوجانے کی خواہش ہوتی ہے۔ چنانچہ مسافروں پر غنودگی طاری ہونے لگی، ہر شخص اپنی جگہ پر جھومنے لگا۔

آہ! عورت کی فطرت بھی کسقدر عجیب ہے! کتنی ناقابلِ فہم اور کتنی پُراسرار، وہ نگار جو ابھی مجھے مسحور کرنے کے لئے اپنے حُسن کی تمام رعنائیوں کو صرف کر رہی تھی، اپنی نگاہوں سے اپنے تاثر اور اپنی بے قراری کا اظہار کر رہی تھی، وہ نگار ایک برابر والی عورت کے شانے پر سر رکھ کر سو گئی، مجھ سے غافل ہوگئی۔

شاید وہ ابتک چُہل کر رہی تھی، میرے جذبات کے ساتھ کھیل رہی تھی، مذاق کر رہی تھی، یا یہ دیکھ رہی تھی کہ اُس کے ترکش کے تیروں میں نشانے تک پہونچنے کی کس قدر اہلیت ہے اور وہ کس حد تک پیوست ہوسکتے ہیں۔ یا پھر اُس کی سفاک نسوانی فطرت اس بات کی خوگر تھی کہ دیر تک بسمل بناکر چھوڑ دیا جائے۔ کچھ بھی ہو، میں تو اپنی جان کی بازی لگا چکا تھا اور میرے وجودِ معنوی پر ایسے زخم آئے تھے۔ جن کا اب مندمل ہونا بہت دشوار تھا۔

نگار سو رہی تھی اور میں......... ان خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ اتنے میں وہ اسٹیشن آگیا جہاں مجھے اُترنا تھا۔ مجھے یہ محسوس ہوا کہ کسی نے مجھ کو ایک گہرے سہانے خواب سے بیدار کر دیا ہے، جھنجھوڑ کر جگا دیا ہے، جنت سے اُٹھا کر زمین پر ڈالدیا ہے، اور دنیا اپنا سنجیدہ، بے کیف چہرہ لئے میرے سامنے کھڑی ہے، میں نے سوچا کہ اب مجھے اس گاڑی سے اُترنا ہوگا، یہاں کی رنگینیوں سے رخصت ہونا پڑے گا، یہاں کی لذتوں کو یہیں چھوڑنا ہوگا، لیکن پھر خیال آیا کہ میں نہیں اُتروں گا، نہیں جاؤں گا، یہاں سے جاکر میں کیونکر زندہ رہوں گا، میرا کیا حال ہوجائے گا، اُس کے بعد "سرکاری کام" یاد آیا اور میں نے پھر اپنے آپ کو اُترنے پر مجبور پایا۔

میں اسی تذبذب میں تھا کہ میری نظر نگار پر پڑی۔ وہ ابھی تک سو رہی تھی۔ اگر وہ جاگ رہی ہوتی تو یقیناً میرے لئے گاڑی سے اُترنا ناممکن ہوتا۔ میں کس کا دل لاتا کہ نگار مجھے دیکھتی اور میں اُس کی نظروں کو، اُس کے ہدیۂ ناز کو ٹھکراتا ہوا چلا جاتا، اپنی زندگی کو کلیجے سے نوچ کر گاڑی میں پھینک جاتا۔ لیکن جب میں نے اُسے سوتا ہوا پایا تو میری پریشانی دور ہوگئی۔ میں نے سوچا کہ موقع کو غنیمت سمجھنا چاہیئے، ایسے میں اپنے اوپر جبر کرکے اُتر جانا چاہئے۔ چنانچہ ایک فیصلہ کن انداز سے اُٹھ کھڑا ہوا اور نہایت خاموشی سے، بالکل چوروں کی طرح نیچے اُتر آیا۔ ایک قلی سے آہستہ سے کہا کہ میرا سامان وہ رکھا ہے، اُتار لو، قلی سامان اُتار رہا تھا اور میں دعائیں کر رہا تھا کہ الٰہی نگار سوتی رہے، اُسکی آنکھ نہ کُھل جائے۔ مگر افسوس! جب قلی میرا تمام سامان اُتار چکا تو نگار اُٹھ بیٹھی اور وحشت بھری نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ قلی نے سامان سر پر رکھ لیا تھا اور وہ چلنے کے لئے تیار تھا، صرف میری رہبری کا منتظر تھا۔ میں چلنے کو مُڑا تو نگار نے اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے "خدا حافظ" کہا۔ میرے اوپر بجلی گر پڑی، جہاں تھا وہیں جم گیا میں نے قلی سے کہا میرا سامان گاڑی میں واپس رکھدو، میں یہاں نہیں اُتروں گا، آگے جاؤں گا، وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگا، اُدھر گارڈ نے بھی سیٹی بجادی لیکن میرا فیصلہ اٹل تھا، میں طے کر چکا تھا کہ اس کھیل کو آخر تک کھیلوں گا، اس مذاق کو کسی نتیجے تک پہونچاؤں گا، اس چہل اور اس ہنسی کو خونیں آنسوؤں کی حد تک کھینچ کر لے جاؤں گا، میں دیکھوں گا کہ دیوانگی، وحشت اور جنون کے دہکتے ہوئے شعلے.........

لیکن میں کچھ حرارت سی محسوس کر رہا ہوں، شاید مجھے بخار چڑھ رہا ہے۔

(طبعزاد)

اختر انصاری بی۔ اے (آنرز)

مصطفےٰ کمال کی زندگی کے چند دلچسپ اوراق

(بہ سلسلۂ ماہ دسمبر ۳۴ء)

اس میں شک نہیں کہ اعلان جمہوریت اور مسئلۂ صدارت طے ہونے کے بعد بظاہر کوئی ایسا مقصد نہ تھا جسکی تکمیل کے لئے مصطفےٰ کمال اُسی جوش و خروش سے کام لیتا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تک جو کچھ ہوا وہ سب مبادیات میں داخل تھا اور اصلِ کار کی طرف متوجہ ہونے کا وقت تو اعلانِ جمہوریت ہی کے بعد آیا تھا، چنانچہ مصطفےٰ کمال نے عنانِ صدارت ہاتھ میں لیتے ہی ملک میں اُن اصلاحات کو رائج کرنا چاہا جو اسوقت تک صرف اس کے ذہن میں موجود تھیں اور جن کا نام بھی وہ کبھی زبان پر نہ لایا تھا۔

اسوقت حالت یہ تھی کہ جمعیت ملی جو حقیقتاً اسکے سیاسی نظام میں ریڑھ کی ہڈی کی سی حیثیت رکھتی تھی، ہر قصبہ اور ہر گاؤں میں پورا اقتدار حاصل کر چکی تھی، فوج کا ایک ایک سپاہی اس کے ہاتھ میں تھا اور بہ حیثیت صدر ہونے کے وہ ملک کی تنہا فرمانروا ہستی سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اب مزید انتظار کی ضرورت نہ تھی اور وہ چاہتا تھا کہ جلد سے جلد اقدام شروع کر دے۔

اس کے احباب کو اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ مذہب کا مخالف ہے۔ جس وقت کبھی اس مسئلہ پر گفتگو ہوتی تھی تو اس کے جوش کی کوئی انتہا نہ رہتی تھی اور وہ کہا کرتا تھا کہ "مذہب آتش فشاں مادہ کی وہ تہ ہے جس کے نیچے قوم کی مشتعل روح دبی ہوئی ہے، میں اس تہ کو توڑ کر قوم کی اس روح کو بر روئے کار لاؤں گا۔" اس کا خیال تھا مذہب زہر ہے جس نے سیاست اجتماعی کو ہلاک کر رکھا ہے اور اس کا دور کرنا ضروری ہے۔

اس طرف مصطفےٰ کا خیال تو یہ تھا لیکن ملک کی حالت یہ تھی کہ ہر شخص مذہب کا شیدائی تھا، مولویوں کا اقتدار بدستور قائم تھا اور اس مسئلہ کو چھیڑنا گویا سارے ملک کو اپنا مخالف بنا لینا تھا، اسی لئے وہ خاموش تھا اور جب کوئی شخص اُس سے پوچھتا کہ جمہوریت ترکی کا مذہب کیا ہوگا تو وہ کوئی صاف جواب نہ دیتا۔ اسی طرح جمعیت ملی کے قیام کے وقت اس نے کوئی ذکر مذہب کا نہ کیا تھا، کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ یہ نام آتے ہی صورتِ حال بدل جائے گی اور سارا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔

چونکہ مصطفےٰ کمال کی اس ذہنیت کا علم اس کے مخالفین کو بھی تھا، اس لئے انھوں نے قیام جمہوریت کے بعد ہی یہ پروپگنڈا شروع کر دیا کہ مصطفےٰ کمال مذہب کا دشمن ہے اور وہ اسلام و خلیفہ دونوں کو مٹا دینا چاہتا ہے۔

اس سے قبل جب عبدالمجید کو خلیفہ بنایا گیا تھا تو مصطفےٰ کمال نے ان تمام مراسم تزک و احتشام کے ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا جو معمولاً اس تقریب میں ادا کئے جاتے تھے۔ اسی طرح جب اسمبلی میں خلیفہ کے اختیارات کی بحث چھڑی تو اس نے یہ کہہ کر گفتگو کو ختم کر دیا کہ:۔

"خلیفہ کی حیثیت شطرنج کے بادشاہ سے زیادہ نہیں اور اُسے کوئی اختیار نہیں مل سکتا۔"

جب خلیفہ عبدالمجید نے اپنے مشاہرہ میں اضافہ کئے جانے کے متعلق لکھا تو مصطفےٰ کمال نے ان الفاظ میں جواب دیا کہ "خلافت محض ایک تاریخی یادگار کی حیثیت رکھتی ہے جس کا وجود بالکل غیر ضروری ہے، اور تمھارا میرے سکریٹری کو اس طرح کی تحریر بھیجنا سخت ناروا جسارت ہے۔"

الغرض اسی طرح کے اور بھی متعدد واقعات تھے جنھوں نے پبلک کو یہ سمجھنے کا موقعہ دیا تھا کہ مصطفےٰ کمال کو مذہب سے کوئی واسطہ نہیں ہے مثلاً شیخ اسلام کی معزولی، اور برقعہ ونقاب کی مخالفت — اور اس لئے مخالفین کے پروپاگنڈا کا کافی اثر ملک میں ہوا۔

ملاؤں اور درویشوں نے مساجد میں سڑکوں پر، خانقاہوں کے اندر اور قہوہ خانوں میں الغرض ہر جگہ مصطفےٰ کمال کے خلاف سازشیں شروع کیں اور اس کے سیاسی مخالفین نے بھی اپنے ایجنٹوں اور اشتہارات وغیرہ کے ذریعہ سے اس میں کافی حصہ لیا۔ اس کے بعد جب رفتہ رفتہ یہ تحریک زیادہ قوی ہوگئی تو مصطفےٰ کمال کی مخالف جماعت انگورا چھوڑ کر استنبول پہونچی اور خلیفہ عبدالمجید کا دامن پکڑا کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ مصطفےٰ کمال جو چاہے کرے لیکن خلافت اور خلیفہ کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔

عبدالمجید ایک سادہ مزاج اور خاموش آدمی تھے اور سازش کرنے والے انسان نہ تھے، لیکن خلیفہ ہونے کے بعد وہ بحیثیت ظل اللہ امیر المومنین پورے تزک واحتشام کے ساتھ باہر نکلنا پسند کرتے تھے اور جب ملک کے تمام درویش، علماء، اور مصطفےٰ کمال کے مخالفین (رؤف، عدنان، رفعت، کاظم قرہ باقر وغیرہ) نے اُن کو آن گھیرا، تو ان کے اندر بھی ایک ولولہ پیدا ہوا اور وہ واقعی اپنے آپ کو تمام جماعت اسلامی کا مرکز سمجھنے لگے۔

مصطفےٰ کمال نے ان تمام حالات کا مطالعہ کیا اور سمجھ گیا کہ حالات اس کے مخالف ہوتے جارہے ہیں اور اگر اس رجحان کو بڑھنے دیا گیا تو کامیابی کی کوئی امید نہیں۔ وہ اسی فکر میں تھا کہ قدرت نے پھر اس کو ایک موقعہ دیا — یعنی سر آغا خاں اور سر امیر علی (مرحوم) نے مسلمانان ہند کی طرف سے مطالبہ کیا کہ خلیفہ وخلافت کو قائم رکھ کر اس کے احترام کو بدستور قائم رکھا جائے۔ یہ تحریر قسطنطنیہ کے اخبارات کو بھیجی گئی اور قبل اس کے کہ انگورا حکومت کو اطلاع ہوتی شائع بھی ہوگئی۔

مصطفےٰ کمال نے فوراً اس کے خلاف پروپاگنڈا شروع کیا اور اہل ملک کو بتایا کہ آغا خاں صرف اسماعیلی جماعت کے قاید و رہنما ہیں اور عام مسلمانان ہند سے انھیں کوئی واسطہ نہیں، علاوہ اس کے وہ انگلستان میں رہتے ہیں، انگریزوں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں اور برطانوی حکومت کے ایجنٹ ہیں۔ چونکہ انگلستان کی طرف سے جذبات نفرت واستکراہ لوگوں میں بہت قوی تھے، اس لئے اس پروپاگنڈا کا اثر نہایت کامیاب ثابت ہوا اور اسمبلی سے قانون پاس کر دیا کہ جو شخص جمہوریت کی مخالفت اور سلطان کی موافقت کرتا ہوا پایا جائے گا وہ ملک کا باغی سمجھا جائیگا اور اس کو سزائے موت دیجائے گی۔

اسمبلی میں بعض مقررین نے خلافت کی موافقت میں بولنا بھی چاہا تو ان کو بٹھا دیا گیا اور اسمبلی سے یہ قانون پاس کرانے کے بعد مصطفےٰ کمال نے ان اخبارات کی گرفت شروع کی جو خلافت کی حمایت میں تھے اور آخر کار اس کے خلاف مذہبی جوش بڑی حد تک فرو ہوگیا۔

لیکن مصطفےٰ کمال کو ہنوز اطمینان نہ تھا، وہ چاہتا تھا کہ سب سے پہلے اپنی فوج کے خیالات کا اندازہ کرے، چنانچہ وہ سمرنا کے قریب پہونچا جہاں سالانہ پریڈ ہو رہی تھی۔ یہاں پہونچکر اس نے فوضی اور عصمت سے مسلسل کئی دن تک گفتگو کی اور ہر وقت اسی جستجو میں لگا رہا کہ اگر اس نے خلیفہ کو نکالنا چاہا تو کیا فوج اس کا ساتھ دیگی یا نہیں۔ آخرکار اس نے ایک دن فیصلہ کر لیا جو اسے کرنا تھا اور گورنر استنبول کے نام فوری احکام جاری کئے کہ عبدالمجید کے تزک و احتشام کے لئے جو فوج فراہم کیجاتی ہے وہ ہٹالی جائے اور اس کا وظیفہ بالکل کم کر دیا جائے۔ اسی کے ساتھ اس نے یہ بھی حکم دیا کہ اس کے ساتھیوں کو فوراً علٰحدہ ہو جانے کی ہدایت کی جائے۔

۳ مارچ سنہ ۲۴ء کو مصطفےٰ کمال نے اسمبلی میں مسودۂ قانون پیش کیا کہ خلیفہ کو نکال دیا جائے اور تمام سلطنت ترکی جمہوری حکومت قرار دیجائے۔ یہ قانون بغیر کسی مخالفت کے پاس ہو گیا اور اسی رات گورنر استنبول کو حکم دیا گیا کہ خلیفہ عبدالمجید کو طلوع صبح سے قبل ترکی سے باہر نکال دیا جائے۔ چنانچہ اس کی لفظ بہ لفظ تعمیل ہو گئی اور اس طرح مصطفےٰ کمال نے گویا پہلا قدم کامیابی کی طرف اٹھایا۔

مصطفےٰ کمال اپنے دشمنوں پر غالب آچکا، ملک پر قبضہ حاصل کر چکا، لیکن اہل ملک کو مفتوح کرنا ہنوز باقی تھا اور یہی دشوار ترین منزل ایسی تھی جس کا طے کرنا اس کا حقیقی مقصود تھا۔ انتزاع خلافت اور خلیفہ کو حدود ترکی سے باہر کرنے کے بعد اس کی صحت پھر خراب ہو گئی۔ اور جیسا کہ خرابی صحت کی حالت میں وہ ہمیشہ نیچی سطح پر آکر عامیانہ لطف و تفریح میں اپنے اوقات بسر کرنے کا عادی تھا، اب بھی اسی میں منہمک ہو گیا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب اس نے لطیفہ کو طلاق دی۔ اس واقعہ کے متعلق مختلف حلقوں میں مختلف خیالات قایم کئے گئے اور بعض نے لطیفہ کے اخلاقی حالت کو بھی مشتبہ نگاہوں سے دیکھا۔ لیکن یہ بالکل بے بنیاد بات ہے۔ حقیقت صرف یہ ہے کہ مصطفےٰ کمال اپنی فطرت کے لحاظ سے سخت عملی انسان واقع ہوا ہے اور جذبۂ محبت و رواداری کبھی اس کے دل میں پیدا نہیں ہوا۔ اس نے عورتوں سے صرف اس لئے واسطہ رکھا کہ ایک مرد اپنی جنسی خواہشات پورا کرنے کے لئے ان سے ملنے پر مجبور ہے اور اس سے آگے بڑھکر اس نے کوئی پرواہ ان کے جذبات کی نہیں کی، یہاں تک کہ وہ نکاح کو بھی چنداں ضروری چیز قرار نہیں دیتا۔

چنانچہ اول اول جب لطیفہ کو اس نے دیکھا تو یہی جذبات مصطفےٰ کمال میں موجزن تھے اور اگر لطیفہ اپنی فراست و دانشمندی سے کام نہ لیتی تو شاید نکاح کی بھی نوبت نہ آتی۔ اب صدر جمہوریت ہونے کے بعد لطیفہ نے اس کی بیوی ہونے کی حیثیت سے سیاسیات میں بھی دخل دینا شروع کیا جیسا کہ یوروپ کی تعلیم یافتہ خواتین کا دستور ہے اور مصطفےٰ کمال نے جو اپنے معاملات میں خدا کا بھی دخیل ہونا پسند نہیں کرتا چہ جائیکہ کسی عورت کا، اس کو ناپسند کیا، آخرکار تعلقات بہت خراب ہو گئے اور سوائے اس کے کہ آپس میں جدائی ہو جائے اور کوئی صورت مناسب نہ معلوم ہوئی۔

اس واقعہ کے بعد مصطفےٰ کمال کی دلچسپیوں میں پھر تغیر پیدا ہوا اور اس نے آزادی کے ساتھ لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر دیا۔ اسی دوران میں دو مرتبہ اس کو ہلاک کرنے کی بھی کوشش کی گئی۔ ایک بار بم پھینکا گیا اور دوسری بار کھانے میں زہر دیا گیا۔ بم سے تو خیر بالکل صاف بچ گیا تھا، لیکن زہر نے تو اس کا کام ہی تمام کر دیا ہوتا اگر فوراً تدبیر نہ کیجاتی۔ بہر حال کچھ ان واقعات نے اور کچھ مرتبہ و وجاہت کے احساس نے

اُسے مجبور کیا کہ وہ لوگوں سے الگ تھلگ رہے اور ہر شخص کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھے۔ چنانچہ اس نے اپنے مکان پر سرچ لائٹ (برقیہ) نصب کرادی اور حکم دیدیا کہ کوئی شخص بلا اجازت مکان کے قریب نہ آئے۔ جب وہ نکلتا تو ایک دستہ محافظ فوج کا اس کے ساتھ ہوتا اور جب چان قایا (اپنی فرودگاہ) سے انگورا جاتا تو اس چار میل کے راستہ میں مسلح سپاہیوں کی جماعت دونوں طرف کھڑی رہتی۔

اگر وہ کسی ہوٹل، قہوہ خانہ میں، یا کسی کے گھر جاتا تو اس کے پہونچنے سے قبل وہ جگہ مسلح پولیس کے سپاہیوں اور خفیہ پولیس کے آدمیوں سے جو ریوالور سے مسلح ہوتے بھر جاتی، البتہ عصمت وغیرہ بعض ممبران اسمبلی سے ملنے میں وہ اتنی احتیاط نہ کرتا تھا، حالات ہی کچھ ایسے تھے کہ نہ وہ کسی پر اعتبار کر سکتا تھا اور نہ کسی کی رائے اپنے خلاف سُن سکتا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں میں اس کے خلاف برہمی پیدا ہوئی اور آہستہ آہستہ یہ طوفان اتنا بڑھ گیا کہ مصطفیٰ کمال ہر وقت اسی فکر میں رہتا تھا کہ دیکھئے یہ سیلاب کب اس کے قدم اُکھاڑ دے۔

ترکی کی اقتصادی حالت اس وقت حد درجہ دردناک تھی۔ لڑائی کی وجہ سے رقبے کے رقبے پامال و ویران پڑے ہوئے تھے، اور افلاس انتہائی حد تک پہونچ گیا تھا، جس وقت رعایا دیکھتی تھی کہ اس نے پانی کی طرح اپنا خون بہا کر دشمن کو ملک سے نکالدیا اور جتنے مصائب اس سلسلہ میں برداشت کئے جاسکتے تھے وہ سب اس نے برداشت کرلئے، لیکن اس کی پریشانی و عُسرت کا وہی عالم ہے، تو وہ چیخ اٹھنے پر آمادہ ہوجاتی تھی، لوگ دیکھ رہے تھے کہ خلیفہ عبدالمجید کے زمانہ میں ان کو قہوہ تو مل جاتا تھا، بچوں کو کبھی کبھی شیرینی بھی میسر آجاتی تھی، بیوی کیلئے عید بقرعید نیا جوڑا بھی بن جاتا تھا، لیکن اب تو سدرمق کے لئے غذا بھی میسر نہیں اور روپیہ کا ملک بھر میں کہیں پتہ نہیں۔ بھاری بھاری ٹکیس لگائے جارہے ہیں، ملک کی تمام نوجوان آبادی فوج میں بھرتی ہوگئی ہے، زراعت اُجڑ گئی ہے، کاروبار بند ہیں اور کوئی صورت ان مصائب کے دور ہونے کی نظر نہیں آتی۔

ظاہر ہے کہ جنگ کے بعد ہر ملک کی حالت کم وبیش ایسی ہی ہوجاتی ہے، چہ جائیکہ ترکی جہاں پہلے ہی سے اقتصادی پریشانیاں پائی جاتی تھیں، اس لئے یقیناً اس میں مصطفیٰ کمال کا کوئی قصور نہ تھا، لیکن اس کے دشمن اس حالت سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر اس کے خلاف لوگوں کو مشتعل کر رہے تھے اور آخر کار وہ اس حد تک کامیاب ہوگئے کہ یہ مسئلہ اسمبلی میں پیش ہوا۔ ممبروں نے کھلم کھلا عصمت اور اسکے ساتھ مصطفیٰ کمال پر بھی لعن طعن شروع کی۔ انھوں نے ترکی کی مالی و اقتصادی حالات پر بحث کرتے ہوئے کہا کہ ترکی لیرا (پونڈ) گرتا جا رہا ہے ملک کی ساکھ ختم ہوگئی ہے، کوئی سرمایہ کسی قسم کا باقی نہیں رہا۔ اگر کوئی جماعت سرمایہ لگانے والی ہے تو باہر کی، لیکن عصمت اس کی سنتا نہیں بندرگاہ سمرنا دو سال سے ویران حالت میں پڑی ہے اور مطلقاً اسکی درستی کا خیال نہیں کیا جاتا، جدید قوانین تجارت نے کاروبار کو اور زیادہ معطل کردیا ہے اور بازار بند ہوتے جاتے ہیں۔ یہ اور اسی قسم کے بیسیوں الزامات تھے جو عصمت اور مصطفیٰ کمال پر قائم کئے گئے۔

اس میں شک نہیں کہ ملک کی جو حالت ان لوگوں نے بیان کی وہ بالکل صحیح تھی اور اس میں بھی کلام نہیں کہ مصطفیٰ کمال نے تمام مالی معاملات اپنے وزیر اعظم عصمت کے سپرد کردئے تھے اور چونکہ عصمت اور مصطفیٰ دونوں صرف سپاہی تھے اور اقتصادی گتھیوں کو سلجھانے کی اہلیت نہ رکھتے تھے اس لئے ان شکایات کا پیدا ہونا بالکل بجا تھا۔

اسمبلی میں یہ تمام مسائل بیان کئے گئے اور عصمت و مصطفیٰ کمال کے خلاف "نا اہلیت" کا ووٹ پاس کرنے کی تجویز پیش کی گئی۔ لیکن

ممبران اسمبلی کو اس میں کامیابی نہیں ہوئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہر دو فریق کے تعلقات حد درجہ کشیدہ ہو گئے۔

قسطنطنیہ میں بہ صدارت رؤف، جاوید کے مکان پر ایک جلسہ منعقد کیا گیا اور مصطفےٰ کمال کی مخالفت میں ایک جدید جماعت قائم کی گئی جس میں بہت سے ساتھی مصطفےٰ کمال کے بھی شریک تھے اور مقصود اس جماعت کا یہ تھا کہ مصطفےٰ کمال کی خود مختارانہ حیثیت کو محو کر کے جدید نظام حکومت قایم کیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر جگہ ان دو مخالف جماعتوں کا ذکر ہونے لگا اور سڑکوں پر گلیوں میں جس جگہ دونوں جماعتوں کے آدمی مل جاتے تو آستینیں چڑھائی جاتیں۔ اسی دوران میں اسمبلی کا ایک جلسہ ہوا جہاں ریوالور باہر نکل آئے اور کشت و خون ہو گیا۔ ان مقتولین میں سے ایک کرنل خلیل تھا جس نے عصمت کے خلاف الزامات قایم کئے تھے۔ اور دوسرا علی شکری جو مصطفےٰ کمال کی مخالفت کی وجہ سے عثمان آغا (افسر باڈی گارڈ) نے دعوت دیکر بلایا اور گولی سے ہلاک کر دیا۔ عثمان آغا نہایت خونخوار شخص تھا اور کہا جاتا ہے کہ وہ ۵۰۰ آدمیوں کا خون اپنے ہاتھ سے کر چکا تھا۔ ہر چند یہ امر پایۂ ثبوت کو نہیں پہونچتا کہ اس نے علی شکری کو مصطفےٰ کمال کے اشارہ سے قتل کیا، لیکن چونکہ وہ باڈی گارڈ کا افسر تھا اس لئے لوگوں کو قدرتاً یہی خیال کرنا چاہئے تھا۔

جس وقت علی شکری کی لاش دیکھی گئی تو تمام انگورا مشتعل ہو گیا اور عثمان آغا کی گرفتاری کا مطالبہ کیا گیا۔ اول اول تو مصطفےٰ کمال نے اس کو گرفتار ہونے سے بچا لیا، لیکن جب ہنگامہ زیادہ ہوا تو وہ خاموش ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گارڈ کے سپاہی مصطفےٰ کمال کے دشمن ہو گئے اور اگر وہ فوراً وہاں سے بھاگ کر رؤف کے مکان میں پناہ نہ لیتا تو شاید ہلاک کر ڈالتے۔

مصطفےٰ کمال نے پبلک کی یہ حالت دیکھ کر ٹیکس (عُشر) موقوف کر دیا تاکہ اضطراب میں کچھ کمی پیدا ہو، اور اسی کے ساتھ عصمت کو موقوف کر کے فتحی کو وزیر مقرر کیا لیکن پبلک نے اس تغیر کا یہ مفہوم لیا کہ مصطفےٰ کمال دب گیا ہے اور اب موقعہ ہے کہ اس کا سر ہمیشہ کے لئے کچل دیا جائے چنانچہ انھوں نے ایک مسودۂ قانون پیش کیا جس کی رو سے صدر کے اختیارات بہت محدود ہو جاتے تھے، اور ہر چند رایوں کی کمی سے یہ قانون پاس نہ ہو سکا، لیکن مصطفےٰ کمال سمجھتا تھا کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔ تمام رعایا اقتصادی پریشانیوں کی وجہ سے برہم تھی۔ جمعیت ملی کا نظام خراب ہو چکا تھا، اس کے اکثر ساتھی اس کا ساتھ چھوڑ چکے تھے، فوج پر اس کو پورا اعتماد نہ رہا تھا، مشرقی حصۂ ملک کے مُلّا اُسکے خلاف جہاد کی طیاریاں کر رہے تھے، نسطوریوں نے بغاوت کر رکھی تھی اور انگلستان نے قبضۂ موصل کا الٹی میٹم دیکر اس کی رہی سہی ساکھ کو بھی برباد کر دیا تھا۔

الغرض مصطفےٰ کمال کے لئے اب کوئی امید باقی نہ رہی تھی کہ دفعتہً کُردوں کی بغاوت کی خبر آئی جو نقشبندی دُرویشوں کی جماعت کہلاتی تھی اور شیخ سعید ان کا سردار تھا۔ انھوں نے جمہوریت کے خلاف اور خلیفہ و سلطان کی حمایت میں نہایت پُرجوش جہاد شروع کر دیا اور دو مہینے کے عرصہ میں حد دود یا ربکر تک قابض ہو گئے۔

آپ مصطفےٰ کمال کی سیرت پڑھیں گے تو آپ کو یہ دیکھ کر حیرت ہوگی کہ جب کبھی مصائب نے گھیر کر اس کو مایوسی و ناکامی کی حد تک پہونچایا، اسی وقت کوئی نہ کوئی سبب ایسا ضرور پیدا ہو گیا کہ پھر وہ اپنے کھوئے ہوئے اقتدار کو حاصل کر سکے۔

چنانچہ اس وقت بھی بالکل یہی صورت پیش آئی کہ کردستان کی بغاوت کی وجہ سے ترکوں نے باہمی آویزش کو بالائے طاق رکھ دیا

اور جس وقت مصطفےٰ کمال باغیوں کی سرکوبی کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا تو ایک ایک ترک بچہ مسلح ہوکر اس کے ساتھ تھا۔

مصطفےٰ کمال نے جس عزم و استقلال، جس جرأت و ہمت بلکہ ایک حد تک جس سفاکی و بیرحمی سے کام لیکر اس فتنہ کو فرو کیا وہ اخبار بین جماعت سے مخفی نہ ہوگا۔ اس نے تمام کُردستان کو خون اور آگ سے لبریز کر کے کھنڈر بنادیا اور اتنا سخت قتل عام کیا کہ تاریخ میں دو ہی چار نظیریں ایسی مل سکتی ہیں۔

مصطفےٰ کمال نے خاص فوجی عدالتیں قائم کرکے اس کا صدر، بلند علی کو بنایا جو اس کا نہایت پُرجوش حامی تھا، اور تمام شیوخ کُردستان کو جن میں شیخ سعید بھی شامل تھا، تہ تیغ کر دیا گیا۔

اس سے فارغ ہونے کے بعد ہی مصطفےٰ کمال نے اپنے مخالفین کی طرف توجہ کی اور اسمبلی کا جلسہ کرکے اپنی تقریر کے دوران میں کہا کہ:-

"ملک کی حالت کبھی درست نہیں ہوسکتی، جب تک غداران وطن ہمارے اندر موجود ہیں اور رؤف، کاظم قرہ باقر، علی فواد، جو مخالف جماعت کے روح رواں ہیں، تمامتر ذمہ دار اس بغاوت کے ہیں، چنانچہ بغاوت کردستان سے چند روز قبل کاظم قرہ باقر اور علی فواد کا فوج سے استعفا دیدینا اور کاظم کا شیخ سعید سے خط و کتابت کرنا (اس نے ایک خط بھی کاظم کا پیش کیا) کیا معنی رکھتا ہے۔ پھر ان لوگوں کا کردستان کو بغاوت پر آمادہ کرنا، حقیقتاً کُردستان کی ہمدردی پر بھی مبنی نہ تھا، بلکہ در پردہ انگلستان کی مدد کرنا مقصود تھا جس نے گزشتہ جنگ میں کُردستان کو ترکی کے خلاف جنگ کرنے کی پوری ترغیب دی تھی اور جسکے متعلق عہد نامۂ سیورے میں وعدہ کیا گیا تھا کہ اس کو ایک خود مختار ریاست بنادیا جائے گا۔ لیکن انگلستان کا بھی یہ طرز عمل کردوں کی فلاح کے لئے نہ تھا بلکہ مقصود صرف یہ تھا کہ اُسے موصل اور اس کے چشمہ ہائے پٹرول کی ضرورت ہے اور کُردستان اس سرزمین کی کُنجی ہے۔

آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ شیخ سعید نے خلیفہ کی حمایت میں علم بغاوت بلند کیا تھا اور یہ امر بھی آپ سے مخفی نہیں کہ خلیفہ اور انگلستان کے کیا تعلقات ہیں۔"

چونکہ مصطفےٰ کمال کو معلوم تھا کہ انگلستان سے ترکی کا بچہ بچہ بیزار ہے، اس لئے اس نے اپنی تقریر میں اسی مسئلہ پر زیادہ زور دیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسمبلی میں مصطفےٰ کمال کی مخالف جماعت کا زور بالکل ٹوٹ گیا جس کے بڑے بڑے اہم سردار مثلاً رؤف، رحمی، عدنان اور خالدہ ادیب خانم (جو آجکل ہندوستان میں ہیں) اس سے قبل ہی ملک چھوڑ چکے تھے۔

مصطفےٰ کمال نے اسی کے ساتھ ایک ہنگامی قانون پاس کرالیا کہ حکومت جمہوریت کے خلاف لکھنا یا بولنا بغاوت میں شمار ہوگا اور اخبارات کا نہایت سختی سے احتساب ہونے لگا۔ ہر چند اب مصطفےٰ کمال برسر اقتدار ہوگیا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ جب تک اس کی مخالف جماعت موجود ہے ہر وقت ردعمل کا اندیشہ ہوسکتا ہے اس لئے اس نے چاہا کہ ان پر باقاعدہ مقدمہ چلاکر باغیوں کا سا سلوک

کرے لیکن فتحی (وزیراعظم) اور کیبنٹ کے بعض اور ممبران اس کارروائی کے مخالف تھے۔ انھوں نے کہا کہ مخالف جماعت میں سے اکثر ان کے دوست ہیں، اور بعض بعض نے (مثلاً رؤف، علی فواد، کاظم قرہ باقر) نے بڑی خدمات انجام دی ہیں۔ پھر علاوہ اس کے ان کے خلاف شہادت بھی ایسی مستحکم نہیں، کہ وہ سیاسی مجرم قرار پائیں۔

مصطفیٰ کمال نے جمعیت ملی کی مرکزی کمیٹی کو طلب کیا لیکن اس میں بھی اختلاف آرار کی وجہ سے کامیابی حاصل نہ ہوئی یہ دیکھ کر مصطفیٰ کمال خاموش ہوگیا اور سمجھ گیا کہ ابھی مناسب وقت اس کارروائی کا نہیں آیا، اس لئے اس نے سوچا کہ اگر مخالف جماعت کے سردار دسترس سے باہر ہیں تو اُن کے ساتھیوں کو تو کم از کم صاف ہی کر دینا چاہئے اس لئے اس نے فتحی کو وزارت سے معزول کر کے عصمت کو وزیر بنایا اور اس نے چُن چُن کر فریق مخالف کے ہمنوا لوگوں کو دار و رسن کے سپرد کرنا شروع کیا۔ اس نے پولیس کو ہدایت کی کہ مخالف جماعت کے سرداروں کی خاص نگرانی کی جائے اور جو ثبوت ان کے خلاف فراہم ہو سکے اُسے مہیا کیا جائے۔

اتفاق سے اسی زمانہ میں مصطفیٰ کمال نے سمرنا جانے کا ارادہ کیا اور اس کے پہونچنے سے دو روز قبل پولیس نے تین آدمیوں کو مشتبہ حالت میں گرفتار کیا جو بم رکھتے تھے۔ ان کے پاس سے ایک خط سعید خورشید کا بھی برآمد ہوا جو اسمبلی میں مخالف جماعت کا نمائندہ تھا۔ اس بہانہ کے ہاتھ آتے ہی مصطفیٰ کمال نے تمام مخالفین کو گرفتار کرنے کا حکم دیدیا اور ان کے خلاف تحقیقات کرنے کے لئے دو جگہ عدالتیں قائم کی گئیں، معمولی قیدیوں کے لئے سمرنا میں اور اہم قیدیوں کے لئے انگورہ میں۔

سمرنا کے قیدیوں میں سے ایک شخص عارف بھی تھا اور جس وقت مصطفیٰ کمال کے سامنے ان قیدیوں کے احکام موت کے کاغذات پہونچے تو اسکو عارف کا نام بھی نظر آیا۔ یہ عارف وہی شخص تھا جو کسی وقت مصطفیٰ کمال کا انتہائی دوست رہ چکا تھا اور بڑے بڑے سخت اوقات میں اسنے اُسکی مدد کی تھی، لیکن چونکہ وہ مخالف جماعت میں شامل ہوگیا، اس لئے ایک لمحہ تامل کئے بغیر اس کے حکم قتل پر بھی دستخط کر دئے۔

انگورہ میں جن لوگوں کے خلاف عدالت گاہیں قائم کی گئیں ان میں سوائے رؤف اور رحمی کے سب شامل تھے (یہ بھاگ کر نکل گئے تھے)۔ عدالتگاہوں کا صدر وہی بلد علی تھا جس نے کردستان کی بغاوت میں یہ خدمت انجام دی تھی۔ جسوقت ان سرداروں کی گرفتاری عمل میں آئی تھی اسی وقت سے دُنیا کے مختلف گوشوں سے ان کی رہائی کے مطالبہ میں آوازیں بلند ہونا شروع ہوگئی تھیں، نیویارک، پیرس اور برلن کی یہودی جماعتوں نے تار پر تار بھیجنا شروع کئے کہ انکو رہا کر دیا جائے، مختلف مالی اداروں نے جن میں راسچائلڈ کے بنک (ویانہ اور لندن کے) بھی شامل تھے اپنی اپنی حکومتوں اور ملکی اخباروں پر زور دیا کہ جاوید کی رہائی کی پوری کوشش کریں بلکہ فرانس سے تو ایک خاص شخص (سارّوت) انگورہ اسی لئے آیا کہ وہ مصطفیٰ کمال سے ملکر ذاتی طور پر اپنا اثر ڈالے کیونکہ یہ فریمیسن لاج کا بڑا زبردست رکن تھا اور مصطفیٰ کمال بھی فری میسنری جماعت سے تعلق رکھتا تھا لیکن مصطفیٰ کمال نے کسی ایک کی نہیں سُنی اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ ان سب کو فنا کر دینا ضروری ہے۔ چنانچہ بلد علی خود ان لوگوں کے احکام موت، مصطفیٰ کمال کے پاس دستخط کے لئے لایا اور مصطفیٰ کمال نے ان پر دستخط کر کے حکم دیا کہ آج ہی رات کو تعمیل ہو جانا چاہئے۔ بلد علی کے رخصت ہوتے ہی مصطفیٰ کمال نے ایک جلسۂ رقص منعقد کیا اور بہت سے مہمانوں کو اس میں مدعو کیا۔ چنانچہ نصف شب کے وقت جب جلسۂ رقص اپنے انتہائی عروج پر تھا، انگورہ سے چار میل کے فاصلہ پر گیس کی روشنی میں گیارہ سولیاں طیار کی گئیں اور ٹھیک اسوقت جب یہاں شراب آلود قہقہوں سے فضا گونج رہی تھی وہاں ترکی کے بڑے بڑے اکابر اپنا دم توڑ رہے تھے (باقی)

صفیر بلگرامی

آرہ اپنی علمی و ادبی مرکزیت کے لحاظ سے نہ صرف بہار بلکہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں معروف ہے، اس نے گزشتہ ڈیڑھ سو برس کے اندر اُردو کی جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں ان کو ادب اُردو کی تاریخ فراموش نہیں کر سکتی، اُردو کا قدیم ترین شاعر جو آرہ میں گزرا ہے وہ مولانا انور علی یاسؔ (متوفی سنہ ۱۲۶۲ھ) تھے، آپ شیخ غلام علی راسخؔ (متوفی سنہ ۱۲۳۸ھ) کے تلامذہ میں تھے، آرہ کی ادبی زندگی کا یہ دور اولین تھا، اسی عہد ماموں میں مارہرہ و بلگرام کے ارباب سخن آرہ میں تشریف لاتے تھے، چنانچہ یاسؔ مرحوم نے حضرت سید سلطان عالم صاحب سجادہ نشین مارہرہ، سید محمد عسکری، سید بندہ علی وغیرہ سے اپنے تعلقات کا ذکر کیا ہے۔

اس دور کے گزر جانے کے بعد ادبی قیادت کی عنان حضرت صفیرؔ مرحوم کے ہاتھ آئی اس عہد میں اُردو کو بہت بڑا فروغ ہوا چنانچہ مطبع کا قیام، مشاعروں کی بنیاد، تصنیفات و تالیفات کا سلسلہ، صحافت کی ترویج اسی زمانہ سے متعلق ہے، اور اسکو ہم اپنی اصطلاح میں خیر القرون کہہ سکتے ہیں اسی دور کی برکات کا یہ اثر ہے، کہ آرہ میں سیکڑوں نامی و ماہر اساتذہ اُردو پیدا ہوئے، شیخ محمد حسن نظیرؔ سید سجان حیدر نذیرؔ، آغا حسن ظہیرؔ، لالہ امر چند جمیلؔ، چودھری ریاض الدین آرزوؔ، برکت خاں سیفیؔ، سید لقمان حیدر اسی دور کے نکتہ سنج شعرا تھے،

صفیرؔ مرحوم کی قیادت کا یہ سلسلہ سنہ ۱۳۰۸ھ میں ختم ہو گیا اور وہ اپنے بعد ایسے ایسے نونہالان ادب چھوڑ گئے جنھوں نے اُردو شاعری کو چار چاند لگا دئے، مولانا اسمٰعیل قہرؔ، مولوی عظیمؔ، شاہ ابراہیم فوقؔ، مولانا ابراہیم فوقؔ، مولانا ضمیر الحق قیسؔ، قاضی واجد حسین وجدؔ سید امیر حسن بدرؔ مولانا ابو الفضل حشرؔ، چودہری فخر الدین فخرؔ، سید قمر الدین قمرؔ، جے نند کمار جوہرؔ نے اپنی نگارش جمیل اور بدیعہ اشعار سے اُردو نظم و نثر کو بڑا فروغ دیا، مولانا قہرؔ بہت بڑے گلتراش اور صناع تھے، مولوی عظیمؔ ظریفانہ شاعری میں بڑی مہارت رکھتے تھے آپ کے صاحبزادہ ابو البرکات برقؔ آرہ کے اُن اکابر شعرا میں ہیں جو مشاعرہ میں میر سوزؔ کی شعر خوانی کے مناظر پیش کر دیتے ہیں شاہ ابراہیم فوقؔ اس عہد کے بہت بڑے ماہر سخن تھے، مولانا ضمیر الحق قیسؔ شمشادؔ لکھنوی کے شاگرد ہیں آپ کو عروض میں پوری دستگاہ ہے، مولانا بدرؔ مرحوم کے "خمخانہ" پر "مخزن" (لاہور) میں ایک بار لکھا جا چکا ہے۔

آج میں اپنے وطن کے مشہور شاعر حضرت صفیرؔ کے حالات و کلام پر تبصرہ کرنا چاہتا ہوں۔

نام و نسب ولادت و وطن | آپ کا نام فرزند احمد، تخلص صفیرؔ ہے ۱۲۴۹ھ میں بمقام مارہرہ اپنے ننہال میں پیدا ہوئے۔

"شمس الضحیٰ" سے آپ کی تاریخ ولادت نکلتی ہے، ایک سال کے ہوئے تو بلگرام آئے جو آپ کا آبائی وطن تھا، چار سال کی عمر میں قصبہ آرہ میں وارد ہوئے، چنانچہ خود فرماتے ہیں:-

مورد و مسکن وطن ہے اے صفیر تین جا مارہرہ، آرہ، بلگرام

آپ کا سلسلۂ نسب یہ ہے:-

فرزند احمد بن میر سید احمد، بن سید غلام یحییٰ، بن سید بندہ علی بن سید خورشید علی سید خورشید علی کا سلسلۂ نسب سید ابوالحکیم بن سید ابوالقاسم ۔ بن سید خان محمد بن محمود وہبتہ کی وساطت سے سید محمد صغریٰ فاتح بلگرام تک اور حضرت صغریٰ کا نسب عیسیٰ موتم الاشبال بن زید شہید بن امام زین العابدین بن امام حسین تک پہونچتا ہے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ سید محمد صغریٰ کے اخلاف میں سے ہیں، سید صاحب نے ۶۱۴ھ میں بلگرام کو فتح کیا تھا اسکے بہت عرصہ قبل سید ابوالفرح واسطی اہل و عیال اور متعلقین کے ساتھ ہندوستان میں آباد ہو چکے تھے، یہی وجہ ہے کہ "سادات صغراوی" خود کو واسطی کہتے ہیں چونکہ ان کے جد امجد واسطہ سے ہندوستان میں آئے تھے۔

اکثر مثالوں میں پتہ چلتا ہے، کہ انسان کی ذہنی ترقی اور تعمیر سیرت میں خاندان کو بہت بڑا تعلق ہوتا ہے، لیکن اس سے ہٹ کر اس کی کوئی اصلیت نہیں اگر ایک شخص علم و فضل کے ساتھ اچھے عادات و خصائل بھی رکھتا ہے، تو پھر اس کے لئے خاندان کا فخر کوئی معنی نہیں رکھتا، لیکن جہاں ہماری ادبیات میں بہت سے زہریلے جراثیم داخل ہو گئے وہاں خاندانی فخر و مباہات کا عنصر بھی شامل ہو گیا اور آج سیرت پر مشکل ہی سے کوئی کتاب دستیاب ہو سکتی ہے، جو اس قسم کے ترہات سے پاک ہو، سر سید نذیر احمد جیسے قومی فدائیوں نے بھی کسی نہ کسی پیرایہ میں اپنی خاندانی عظمت کا تذکرہ کیا اور "حیات جاوید" کے مصنف حالی نے تو سر سید کو بت بناکر رکھدیا۔

میں یہاں مختصراً سید فرزند احمد صاحب کے ان افکار پر ایک تنقید کرنا چاہتا ہوں جو انھوں نے اپنے نسب و حسب کے سلسلہ میں ظاہر کئے ہیں، فرماتے ہیں:-

> "بسکہ سادات صغراوی بلگرام کو حفظ نسب کا خیال سب خیالوں سے بڑھکر ہے، اور اس کی احتیاط ابتک کہ سات سو برس سے زیادہ ہندوستان میں آئے ہوئے، بڑے زور شور سے رہی ہے، کہ دوسری قوموں کو جائے رشک، اور باعث استعجاب، او روجہ رغبت ہے اور اس حفظ نسب کی مشق یہاں تک کی گئی ہے کہ جس قدر قربت میں نسبت ملتی ہے، وہ باعث فخر ہوتی ہے، اور انتہا یہ ہو گئی ہے کہ احتیاط کرتے کرتے چار بھائیوں سے اگر بڑے بھائی کی اولاد سے سنجھلے اور منجھلے کی اولاد سے چھوٹے کی اولاد کو وصلت واقع ہوئی اور اس وصلت کو تواتر ہو گیا ہے تو وہ بھائی اسی کا ہو گیا گویا بڑے اور سنجھلے کو منجھلے اور چھوٹے سے اور چھوٹے اور منجھلے کو بڑے اور سنجھلے سے قرابت ہی باقی نہیں رہی۔" (تاریخ بلگرام ص ۱۳۵)

"یہ قصبہ (بلگرام) سادات ہی کی بود و باش کے سبب سے مشہور ہوا ہے اور اعلیٰ درجہ کے ساکنین سادات ہی شمار کیے جاتے ہیں اور ان سادات کی ناموری "خاندانی" کے لقب سے شہرت پذیر ہوئی اور خاندانی ہونا خوبی اصلیت و نجابت و شرافت کی دلیل ہے، پس سادات صغرادی کے حفظ نسب نے یہ جلوہ دکھایا کہ سب لوگ ان کی بزرگی کے قایل ہیں" (تاریخ بلگرام ص ۱۷۰)

"اگرچہ بفضل خدائے یکتا عاصی کے بزرگوار حسب و نسب میں نامورِ زمانہ اور علم و فن میں یگانہ ہوتے آتے ہیں"

(صفیر بلبل ص ۱۲۵)

صفیر مرحوم نے اسی طرح صفیر بلبل، تاریخ بلگرام، معراج الخیال، اور جلوۂ خضر کے کثیر صفحات رنگین کئے ہیں، میرا روئے سخن صفیر مرحوم کی طرف نہیں کیونکہ اب وہ دنیا میں باقی نہیں میں ان کو ایک بزرگ خاندان کا قابل رشک فرزند خیال کرتا ہوں، انفرادی اعتبار سے جو کچھ صفیر نے اپنے نسب و حسب کے متعلق لکھا ہے، وہ محل اعتراض نہیں، لیکن آپ نے سادات صغرادی کے عجیب و غریب تخیل نسبی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، وہ نہ صرف نظریۂ قومیت بلکہ اسلام کی روح تعلیم کے بھی منافی ہے

سادات صغرادی کو بروایت صفیر حفظ نسب کا جنون ہے، جیسا کہ ان کے سطور بالا سے پتہ چلا ہوگا اب غور طلب یہ امر ہے کہ واقعتاً یہ سارا داعیہ فضل و شرف بقول غالب "رعایت مستی و ذوق" کا نتیجہ ہے یا اس کے اندر کچھ حقیقت بھی ہے ؟ -

ہم نے یہ مانا کہ سید ابو الفرح ہندوستان میں اہل و عیال کے ساتھ تشریف لائے تھے، اور اس لئے سادات صغرادی کی نسل میں کسی غیر عنصر کا شامل ہونا مستبعد ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ سید ابو الفرح اور حضرت امام حسین کے درمیان جو پشتیں گزری ہیں ان میں کوئی غیر فاطمی خون شامل ہوا ہے یا نہیں ؟ پہلے تو حضرت امام زین العابدین ہی کی والدہ ایرانی تھیں اس کے بعد حضرت زید شہید کی والدہ ام ولد (لونڈی) تھیں پھر آپ کے صاحبزادہ عیسیٰ موتم الاشبال ساری عمر خلیفہ منصور اور مہدی عباسی کے آوان حکومت میں مخفی رہے اور لوگوں کو اجرت پر پانی پلایا کرتے تھے، اسی لئے آپ کا لقب "سقہ" ہوگیا چنانچہ ۱۶۶ھ میں بمقام کوفہ آپ نے اسی اختفائی حالت میں وفات کی اس وقت آپ کی عمر چھیالیس سال کی تھی (ملاحظہ ہو صحاح الاخبار علامہ رفاعی ص ۳۵ و ۳۶) خلیفہ منصور ۱۳۶ھ میں تخت خلافت پر بیٹھا، اور خلیفہ مہدی نے ۱۶۹ھ میں وفات کی، چونکہ بروایت رفاعی، حضرت عیسیٰ موتم الاشبال نے ۱۶۶ھ میں بعمر ۴۶ سال وفات کی اس لئے ۱۲۰ھ آپ کی تاریخ ولادت قرار پائی، لہذا نتیجہ نکلا کہ منصور کے زمانہ خلافت میں آپ سولہ برس کے تھے، ظاہر ہے کہ آپ اس وقت مجرد ہوں گے اور آپ کو وطن سے دور مخفی طور پر اپنا عقد کرنا پڑا ہوگا اس کے بعد آپ کے صاحبزادے، زید، احمد، محمد و حسین پیدا ہوئے جو سادات صغرادی محمد کے اعقاب میں ہیں، کیا، سادات واسطی بتا سکتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ موتم الاشبال نے اس بے لبسی و آشفتگی کی زندگی میں کسی فاطمیہ سے رشتۂ ازدواج باندھا تھا؟ ایسی صورت میں سادات صغرادی غور کریں کہ نسب و حسب کے پندار، اور رشتۂ ازدواج کے قیود میں وہ کہاں تک حق بجانب ہیں، آج ہندوستان کے اندر سینکڑوں کی تعداد میں ایسے صغرادی سادات کے گھرانے موجود ہیں جن کو ان کی برادری کے مجرمانہ قیود نے حد درجہ بے نام و ننگ بنا رکھا ہے آپ کا علم و فضل مسلم، آپ کی فاطمیت مصدق، لیکن یہ محشرستان

رسوم کیسا؟ خدا کے لئے غور کیجیے ساڑھے چھ سو سال کے اندر آپ کی دنیائے خیال نے آپ کی برادری کے اندر کیسی قیامت برپا کر دی، اب آپ کے یہاں آزاد جیسا ادیب جلیل، عبد الجلیل جیسا لغوی، مبارک جیسا محدث، سید اسمٰعیل جیسا متکلم کیوں نہیں پیدا ہوتا، پستغانے سید علی بلگرامی، اور سید حسین اب کئی سو برس سے آپ کے یہاں سے علم و ادب کا مہر درخشاں کیوں نہیں طلوع ہوتا، آپ جس کو موجب فخر سمجھ رہے ہیں وہ آپ کے جسمانی و ذہنی ادبار کا موید ہے۔

صفیر کا خاندان علم و فضل کے اعتبار سے بہت بلند اور سر برآوردہ تھا آپ کے اجداد پدری میں مسلسل کئی پشت تک شعر و ادب کا ذوق رہا چنانچہ خورشید علی صاحب خورشید خود شاعر تھے، آپ کے فرزند بندہ علی بندہ اور پوتے غلام یحییٰ صاحب یحییٰ کو بھی شعر و سخن کا مذاق تھا صفیر کے والد سید احمد صاحب نے اُردو میں شعر کہنا شروع کیا یہی خاندانی شاعری صفیر مرحوم کو بھی ورثہ میں ملی۔

یہ تو دادھیال کی حالت تھی، آپ کے نانا سید صاحب عالم صاحب بہت بڑے ادیب اور شاعر تھے، غالب نے "اُردوئے معلی" اور "عود ہندی" میں آپ کو جو خطوط لکھے ہیں ان سے آپ کا پایہ ادبی واضح ہوتا ہے، "صفیر بلبل" کے آخر میں حضرت صاحب عالم کی ایک تاریخ طبع بھی مرقوم ہے، غالب نے بھی صفیر مرحوم کی "رشحات" پر دیباچہ لکھا، جو عود ہندی کے آخری صفحات میں پایا جاتا ہے، الغرض صفیر مرحوم پشتینی شاعر تھے، آنکھیں کھولیں تو نانا اور دادا کی آغوش میں شعر و ادب کا درس لیا۔

تصنیفات صفیر مرحوم نے اپنی ساری زندگی تصنیف و تالیف، اور شعر و سخن میں بسر کی، آرہ میں سب سے پہلے آپ ہی نے اپنا مطبع "اسٹار آف انڈیا" قایم کیا جہاں سے اُردو میں دو اخبار نکلے، آپ نے مختلف فنون پر کتابیں لکھیں ان میں بعض تو طبع ہو چکی ہیں اور بعض کا قلمی مسودہ آپ کے خاندان میں محفوظ ہے۔

"صفیر بلبل"— یہ آپ کے منتخب کلام کا مجموعہ ہے، جو ۱۲۸۰ھ میں آپ کے شاگرد شاہ حفاظت حسین حقیر کے اصرار سے شائع ہوا تھا، مقالہ ہذا میں یہی کتاب پیش نظر رکھ کر آپ کے کلام پر تنقید کی گئی ہے۔

"تاریخ بلگرام"— اس کا ایک مطبوعہ حصہ میرے پاس ہے، تاریخ طباعت مذکور نہیں یہ آپ کے ابتدائی زمانہ کی تصنیف معلوم ہوتی ہے، اس میں سادات صغرادی کا شجر، بلگرام کا جغرافیہ، محلات کی تفصیل، اور برادری کے رسوم و رواج کا مفصل تذکرہ ہے۔

"رشحات صفیر"— یہ آپ کا بہت بڑا ادبی کارنامہ ہے، اس میں آپ نے تذکیر و تانیث کے متعلق مبسوط علمی بحث کی ہے اور اساتذۂ قدیم کے اشعار سے استدلال کیا ہے، اسی کی ایک تلخیص "خلاصہ فیض صفیر" کے نام سے شایع ہوئی ہے۔

"میلاد معصومین"— یہ کتاب بہت زیادہ مشہور ہے، اس میں ائمہ اثنیٰ عشری کے حالات درج ہیں ——— "جلوۂ خضر" بھی آپ ہی کی تالیف ہے— ان کے علاوہ آپ نے اور بھی غیر مطبوعہ کتابیں چھوڑی ہیں جن کا حال صفیر بلبل اور تاریخ بلگرام سے معلوم ہوتا ہے، مصنف کا خود بیان ہے کہ انھوں نے تیس مثنویاں لکھیں، اُردو میں پانچ قصے لکھے، "قصہ بوستان خیال" کی اٹھارہ جلدوں کا فارسی سے اُردو میں ترجمہ شروع کیا تھا، ۱۲۷۰ھ ہی میں غزلیات کا اتنا بڑا مجموعہ تیار ہو گیا تھا کہ کئی دیوان مرتب ہو جاتے اس کے بعد ستائیس سال اور زندہ رہے، خدا جانے کتنی غزلیں کہیں، ۱۲۸۰ھ میں لکھنؤ سے واسوخت کا ایک مجموعہ "شعلہ جوالہ" کے نام سے شایع ہوا تھا،

اس میں صفیر کا واسوخت بھی شامل ہے،

رفقا و تلامیذ آرہ کے جوہر، وجد، بدر، جمیل، نظیر، آرزو وغیرہ تو خیر ان کے تلامذۂ ارشد میں تھے ہی عظیم آباد کے بہت سے شعرا کے ساتھ آپ کے مراسم و روابط تھے، چنانچہ اس سلسلہ میں مفصلہ ذیل بزرگوں کے نام گنائے جا سکتے ہیں۔

مرزا انور علی انور عظیم آبادی، مرزا ابو یوسف بیگ یوسف عظیم آبادی، علی مرزا وفا عظیم آبادی، آغا مرزا عطا عظیم آبادی، حامد حسین عرف میرن صاحب نکہت عظیم آبادی، علی محمد شاد عظیم آبادی وغیرہ، ان تمام حضرات نے "صفیر بلبل" کی تاریخ طبع لکھی ہے۔

اولاد آپ کی پہلی بی بی بلگرام کی تھیں ان سے صرف ایک صاحبزادہ زندہ رہے، مثنوی معراج الخیال میں آپ نے ان کا تذکرہ کیا ہے، فرماتے ہیں:۔

از من نور احمد است یک پور روشن کن خانہ چشم را نور

نور احمد صاحب نے دو صاحبزادے چھوڑے سید عنایت احمد دلگیر اور سید وصی احمد فانی دونوں ڈپٹی کلکٹر ہیں، دلگیر صاحب مشاعرے میں ایک خاص انداز سے پڑھتے ہیں، وصی احمد صاحب فانی بہت بڑے ادیب اور شاعر ہیں نثر میں آپ نے بہت سی موقر خدمات انجام دی ہیں، چنانچہ "نگار" میں "ملک خطا کے شہزادے" "گونڈہ گزٹ" میں "دیر و حرم کا افسانہ" اور "ندیم" میں "جلترنگ کے تین بیٹے" شایع ہو کر فانی صاحب کو غیر فانی بنا چکے ہیں، فانی صاحب سے مجھے غائبانہ عقیدت ہے۔

صفیر مرحوم نے دوسرا عقد آرہ میں کیا تھا ان سے دو صاحبزادے سید غنی حیدر اور حافظ سید ولی حیدر گوہر صاحب ہوئے لوگوں کا بیان ہے کہ غنی حیدر مرحوم رفتار و گفتار، عادات و خصایل، شکل و صورت میں حضرت صفیر مرحوم سے بہت مشابہ تھے، غنی حیدر صاحب نے پہلے آرہ میں ایک "مطبع مصطفائی" قایم کیا اس کے بعد کلکتہ تشریف لے گئے وہاں "مطبع ستارہ ہند" قایم کیا یہ مطبع ہندوستان کے چند اعلیٰ مطابع میں ہے، یہاں کی اعلیٰ طباعت و کتابت ہندوستان و ایران میں مشہور ہو چکی ہے، غنی حیدر مرحوم نے آخری عمر میں حج کیا، آپ بہت بڑے خطاط ہفت قلم تھے، حافظ ولی حیدر صاحب "کتب خانہ حیدری آرہ" کے مالک اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں آپ کو شعر و سخن کا بہت بڑا ذوق ہے، گوہر تخلص کرتے ہیں اور آرہ کی "بزم ادب" کے صدر ہیں،

صفیر کی شاعری سطور بالا میں لکھا جا چکا ہے، کہ صفیر مرحوم کے اجداد پدری و مادری دونوں میں نسلاً بعد نسلٍ شاعری چلی آتی ہے، اس لئے صفیر کو گہوارہ ہی میں شاعری کا درس ملا، پندرہ برس کی عمر سے آپ نے شعر کہنا شروع کیا پہلے اپنا کلام چھپایا، پھر دو تین سال کے بعد سید محمد مہدی متخلص بہ تجبر سے اصلاح لینی شروع کی، تجبر مرحوم صفیر کے دادا کے چچازاد بھائی تھے، اس کے بعد صفیر کو لکھنؤ کا شوق ہوا، اپنا کلام شیخ امان علی سحر کو دکھلایا مرثیہ گوئی کی طرف طبیعت راغب ہوئی، مرزا سلامت علی دبیر سے اصلاح لی، سحر مرحوم نے لکھنؤ چھوڑا، اور دبیر کو عظیم آباد والوں نے مدعو کیا وہ یہیں آ گر رہے، صفیر مرحوم بھی عظیم آباد میں نواب الطاف حسین خان بہادر کے یہاں قیام پذیر ہو گئے آرہ سے برابر آمد و رفت کا سلسلہ قایم تھا، مرزا دبیر نے محبت و رافت کے ساتھ آپ کی پذیرائی کی۔

صفیر کی شاعری ایک معجون مرکب کی حیثیت رکھتی ہے، ان کی شاعری پر خبر، سحر، دبیر کے علاوہ اور اساتذہ کا بھی اثر پڑا ہے، چنانچہ خواجہ وزیر، حیدر علی آتش، صبا، قدر بلگرامی وغیرہ کے کلام سے بھی انھوں نے استفادہ کیا تھا بعض مقطعات میں صفیر نے ان لوگوں کا تذکرہ کیا ہے :-

شکر ہے دل میرا شل حضرت آتش صفیر — عاشق شیدا علی مرتضیٰ کا ہو گیا

طرز وزیر میں لکھی اچھی غزل صفیر — اب آپ کا کلام بھی پرکار ہو گیا

اب دیکھئے بقول صبا کیا بنے صفیر — آئی بہار داغ جنوں پھر ابھر چلے

صفیر قدر کا ہے اشتیاق مدت سے — ہمارا عزم سوئے بلگرام ہے بیشک

لیکن "صفیر بلبل" پر ایک نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کے یہاں میر کے سوز و گداز، غالب کی مضمون آفرینی، وجدت طرازی، ناسخ کی محاورہ بندی، و رعایت الفاظ، داغ کی رندانہ سیہ مستی و سلاست نگاری کی بھی کافی مثالیں موجود ہیں۔

طرز میر ایک ایسے شاعر سے جس نے لکھنوی اساتذہ کی تربیت سے استفادہ کیا جو لکھنؤ کی ناسخی فضا سے متاثر ہوا، جس نے داغ کی سی رنگ رلیوں کو سراہا، جس نے شاہان اودھ کے عشرتکدوں کے اُجڑنے پر ماتم کیا۔

صفیر کھا گئی حاسد کی آنکھ لکھنؤ کو — کہاں وہ دن کہاں پریاں کہاں وہ قیصر باغ

کیا ہم اُمید کر سکتے تھے کہ وہ اپنے دل کی گہرائیوں میں لذت غم اور پیام روح کا سرمایہ بھی رکھتا ہو گا، لیکن جب اس کے کلام کا جائزہ لیا جاتا ہے، تو اس کے یہاں بیشتر ایسے اشعار نکلتے ہیں جو میر کے سوگوارانہ انداز بیان سے مالا مال ہیں [1]

پھر کیا کروں نہ روؤں جو کہہ کیکے ہائے دل — اک درد رہ گیا ہے فقط اب بجائے دل

کیا شکوہ دہر اگر کہیں جاتے نہیں ہیں ہم — مدت سے اب تو آپ میں آتے نہیں ہیں ہم

تو نے تو بڑھکے خاک میں مجھ کو ملا دیا — اے آرزوئے دل تو ہی مل جائے خاک میں

---

[1] (نگار) اول تو صرف چند اشعار پر اعتماد کر کے یہ حکم لگانا کہ صفیر کے کلام میں میر کا سوز و گداز پایا جاتا ہے درست نہیں دوسرے یہ کہ جو اشعار انتخاب کئے گئے ہیں وہ خود میر کے رنگ سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔ صفیر بلگرامی کو میر و غالب سے ممکن ہے بہت عقیدت رہی ہو لیکن رنگ سخن کو اُن سے کوئی نسبت نہیں وہ خالص لکھنوی اسکول کے شاعر تھے اور اسی رنگ میں انھوں نے ہمیشہ شاعری کی

....

....

....

....

صاف ہم سے ہوا وہ گل اس وقت　　ہائے جب موسم بہار نہیں

زندگی وہی جو ناکامیوں میں بسر ہو،

آج آتا ہے شوخ غارتگر　　دین و ایمان کا خدا حافظ

پھر ہمیں یاد آیا کوئے صنم　　لے چلے ناصحا خدا حافظ

پابوس یار کی حسرت نہایت ہے صفیر　　خاک میری کاش کے بنتی مکان نقش پا[1]

پھر گئے ہم سے یار کیا کہنا　　یونہی کرتے ہیں پیار کیا کہنا

لباس سے ہیں نہ واقف نہ تاج سے واقف　　تمھارے وحشی نہیں احتیاج سے واقف

اتباع غالب "صفیر بلبل" میں بہت سے ایسے اشعار ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ غالب کے کلام نے صفیر کے دماغ پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ صفیر نے غالب کو دیکھا تھا، حضرت صاحب عالم صاحب مارہروی کے نواسہ کی حیثیت سے غالب صفیر کو بہت ہی محبت و رافت کی نظر سے دیکھتے تھے چنانچہ "رشحات صفیر" کے دیباچہ میں غالب مرحوم لکھتے ہیں :-

سیدی سندی نور بصر، لخت جگر قرۃ العین اسد، مولوی سید فرزند احمد کی طول عمر، و دوام دولت و بقائے اقبال کی دعا مانگتا ہوں جن کو مبداء فیاض سے اس رسالے کے لکھنے کی توفیق عطا ہوئی ہے سبحان اللہ تانیث و تذکیر کی تقریر کردہ اور مطالب کی توضیح پر جو مشتمل ہے، کس لطف سے ادا ہوئی ہے (عود ہندی ص ۱۸۳) -

افسوس ہے کہ ہمارے وطن کے اس ہیرو نے بجائے دہلی، لکھنؤ کی طرف توجہ کی، اور سحر مرحوم کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اگر وہ غالب جیسے شفیق اُستاد سے اصلاح لیتے تو یقیناً آج صفیر بہار کے سب سے بڑے شاعر ہوتے، لکھنؤ کی شاعری کے اس صنف نے جو زلف و

---

[1] یہ شعر میر کے رنگ میں ہے تو ضرور، لیکن غالب کے ایک شعر سے مل جاتا ہے

مشہد عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا　　کسقدر یارب ہلاک حسرت پابوس تھا

صفیر نے سادہ الفاظ میں جس آرزو کا اظہار کیا ہے، وہ غالب کی جدت تخیل اور بلند پروازی سے زیادہ اثر آفریں ہے یہی غالب اور میر میں فرق ہے۔

(نہ میر کا رنگ ہے نہ غالب کا - اڈیٹر)

چوٹی، شانہ و زلف سرمہ و مسی سے متعلق تھا ان کے اندر پریشان نظری و ادبی گمراہی پیدا کر دی چنانچہ وہ اپنی فطری و دیعتوں سے کام نہ لے سکے مگر صفیر مرحوم کو زیادہ مورد الزام نہیں بنایا جا سکتا، کیونکہ اس عہد میں غالبؔ کی مشکل پسندیاں کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھی جاتی تھیں، لیکن آج وہ دور بھی آگیا جب کہ ہندوستان کا ہر ادیب غالبؔ کے مختصر اُردو دیوان کا حافظ ہے، ہر انشا پرداز اس کے بدیعہ شعری سے استدلال کرتا ہے، فلسفی اس کو فلسفہ طراز، نفسی اس کو ماہر نفسیات، مصور اس کو اپنا موضوع تخیل بنائے ہوئے ہے اور مشرق کا یہ فاقہ مست شاعر اپنی ناکامیوں اور حسرت سنجیوں کے بعد جب دنیا سے رخصت ہو گیا تو اہلِ دنیا اس کو چوم چاٹ رہے ہیں، غالبؔ کی ناکام زندگی اور کامیاب موت فطرت کی ستم ظریفیوں کی ایک عبرت آموز مثال ہے۔

صفیر مرحوم نے غالبؔ کی تقلید میں جو اشعار کہے ہیں ان میں دقتِ معنی اور بلندی تخیل کے ساتھ غالبؔ کے مخصوص طنزیاتی رنگ کا بھی تتبع کیا گیا ہے، فرماتے ہیں:-

زاہدا حور تری میری پری　　　خلد تیرا ہے پرستان مرا

فرطِ دعا رجنت وحور و قصور سے　　　خم ہو کے شیخ صورت محراب ہو گیا

غالبؔ کا ایک شعر ہے:-

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں　　　سر زیرِ بارِ منتِ درباں کئے ہوئے

صفیر کہتے ہیں:-

محفل میں اسکی آئے بھی لوگ اور چلے گئے　　　میں نامرادِ منتِ درباں میں رہ گیا

تخیل کے اعتبار سے دونوں شعر برابر ہیں البتہ غالبؔ کے خاص اسلوب نے ان کے شعر میں زیادہ گداختگی و برشتگی پیدا کر دی ہے۔ صفیر کہتے ہیں:

نگاہِ گرم، رحمت سے نہیں کم، زار کو تیرے　　　فروغ طالع اپنا، شعلے کو، ہر خار و خس سمجھا

بالکل اسی معنی میں اور انھیں فقروں کے ساتھ غالبؔ کے یہاں بھی ایک شعر ہے:-

فنا کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا　　　فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن پر

غالبؔ نے تصوف کی چاشنی پیدا کر دی ہے، صفیر، معشوق کی گرم نگاہیوں کو رحمت بتاتے ہیں، لیکن دونوں کے یہاں اسلوب بیان ایک، مشبہ بہ، اور وجہ شبہ ایک، کیونکہ دونوں خار و خس کے جل اُٹھنے کو "فروغ طالع" سے تعبیر کرتے ہیں،

صفیر کا ایک مطلع ہے:-

عشق اور حسن کا چرچا رہا دیوانوں تک　　　سب یہ ساماں تھا ترے بے سر و سامانوں تک

غالبؔ فرماتے ہیں:-

منصبِ شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا　　　ہوئی معزولی انداز و ادا میرے بعد

اسی طرح جستجو کی جائے تو صفیر کے یہاں بہت سے ایسے اشعار ملتے ہیں جن کا غالب کے کلام سے توارد ہو جاتا ہے، ذیل کے اشعار غالب کی پیروی کا نتیجہ ہیں۔

اُڑتی پھر گئی خاک مری کوئے یار میں
مجنوں ہی تھا جو تھک کے بیاباں میں رہ گیا

رندوں نے سمجھے معنی توحید و لا شریک
زاہد تو بحث گبر و مسلماں میں رہ گیا

ہے یاد شور خندۂ دنداں نمائے یار
سینے نمک بھرا ہے، دلِ چاک چاک ہیں

اُٹھاؤں کس طرح دل اس بتِ بے مہر کافر سے
کہ فرطِ لاغری سے خود جہاں سے اُٹھ چلا ہوں میں

دکھا خدا کیلئے شمع رو کہ ڈھونڈوں میں
ہجوم گریہ میں تارِ نظر نہیں ملتا

دار الشفائے عشق کی ہر رسم و راہ اور
اچھا وہی رہا کہ جو اچھا نہ ہو سکا

غالب کہتے ہیں:- "میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا"

داغ کی پیروی | "صفیر بلبل" کے اوراق کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک ناقد حیران رہجاتا ہے، کہ وہی شاعر جو میر و غالب کی زبان استعمال کر رہا تھا، جس کے الفاظ میں خواجہ درد کے جذبات کارفرما تھے وہ یکایک اس ادنیٰ سطح پر کیونکر چلا آیا یہ نتیجہ ہے اسی بے راہروی کا جو مختلف اساتذہ کے تتبع سے کسی شاعر کے کلام میں پیدا ہو جاتی ہے، صفیر مرحوم نے پیاپے ایسے اُستادوں سے اصلاح لی جو مختلف بلکہ متضاد رجحان رکھتے تھے، سطور بالا سے پتہ چلا ہوگا کہ صفیر کے ننیہال کو غالب کے ساتھ گہرے مراسم تھے حضرت صاحب عالم صاحب اور غالب دونوں کا کلام انھوں نے مطالعہ کیا پھر لکھنوی اساتذہ کے دواوین دیکھے نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک معجون مرکب بن گئے، ذیل کے اشعار داغ کے رنگ کے ملاحظہ ہوں:-

رشک انگیز آج کیسا ماجرائے آب تھا
لگے سینہ پر جو دریا میں کف سیلاب تھا

یعنی معشوق نہا رہا ہے، اور کف سیلاب اس کے سینہ سے گزر رہا ہے، یہ دیکھ کر ہمارے شاعر کو پانی میں رشک آتا ہے۔

ان دنوں بوسوں کے باقی ہو لگاتے جاتے
ورنہ سابق میں حساب آپ کا بیباق رہا

گدگداتے تھے جو ہم کہتے تھے وہ
دیکھئے اب یہ مرا ہاتھ آیا،

صفیر کے یہاں اس رنگ کے اشعار کی کمی نہیں، وہی سطحیت، وہی بوالہوسی، وہی جذبات پست کی ترجمانی جو لکھنوی اسکول کے

ایک خاص دور میں مایۂ نازش تھی ان کے یہاں بھی ہے، ملاحظہ ہو:۔

کون عارض سے ملاتا ہے تمھارے عارض
نہ ڈرو میں ابھی رکھے ہوں کنارے عارض

اور یہ مرحلہ یہیں تک ختم نہیں ہوتا بلکہ اس کا انجام یہ ہوتا ہے:۔

آرسی دیکھ کیے وصل میں کہنا ان کا
دیکھو تو ہو گئے نیلے مرے سارے عارض

اس سے بھی ایک پُر لطف شعر سُنئے اور شاعر کے حساس دل اور ذہن رسائی کی داد دیجئے:۔

رنگا کر کاہے انگیا اپنی چھاتی پر جمائی ہے
یہ اس نے خاتمہ بالخیر اپنے پال ڈالے ہیں

شاعر نے اپنی روایاتی تہذیب سے ہٹ کر یہاں محض تفنن شعری کی بنا پر وہ سب کچھ کہہ ڈالا جس کو نثر میں ادا کرنا "غیر مہذب" سمجھا جاتا ہے، شعر کا مطلب یہ ہے کہ شاعر کی محبوبہ نے رنگین انگیا پہنی ہے، وہ اس کو دیکھ کر سمجھ رہا ہے کہ اس کی محبوبہ نے "خاتمہ آم" کا پال ڈالا ہے۔ اسی قسم کی ایک اور شوخی ملاحظہ ہو:۔

سودائے خام ہے طمع اس نونہال سے
سینہ سپاٹ ہے ابھی ہموار کیا کریں

پھل جوانی کا ملے غیرتِ گلشن کب تک
دیکھئے اُبھرے یہ رپر دترا جوبن کب تک

الغرض "صفیر بلبل" کے صفحات میں اس نوع کی سطحی اور سوقیانہ شاعری کے اور بھی بہت سے نمونے موجود ہیں۔

ناسخی اسکول | صفیر کے یہاں ناسخیت بھی پائی جاتی ہے، محاورہ زبان، رعایت الفاظ، نازک تشبیہات و استعارات انکے یہاں بھی ہیں۔

چڑھ گیا جب سے نظر پر آپ کی
اپنی نظروں سے بھی بندہ گر گیا

رات دن سرمست رکھتے ہیں خیالات اے صفیر
دل بغل میں ہے کہ شیشہ بادۂ گلفام کا

ڈوب مرنے پر بھی سودائی اسیر آب تھا
موجیں تھیں زنجیر پا، طوق گلو گرداب تھا

انکے لبوں نے قہقہوں پہ ایسا دھر لیا
کٹ کٹ کے رنگ لعل بدخشاں میں رہ گیا

بے وجہ نہیں آپ الگ پھرتے ہیں ہم سے
کچھ جوڑ مقرر کسی اُستاد نے مارا

دھیان اس محیط حسن کا آنکھوں میں آ گیا
دیکھو کہ دو حباب میں دریا سما گیا

دعائیں پڑھنے لگے پاؤں جلد اُٹھانے لگے　　کبھی جو بھول پڑے عاشقوں کے مدفن میں

باتیں سُن سُن کے اسکی جیتے ہیں　　چشمۂ خضر ہے، دہن ہم کو

اساتذۂ فارسی سے استفادہ صفیر مرحوم کے بہتیرے اشعار جاؔمی، عرفیؔ، حزیںؔ، اور شعرائے متاخرین کا ترجمہ معلوم ہوتے ہیں، یہ بھی نتیجہ ہے، فارسی دواوین کے زیر مطالعہ رہنے کا،

صفیر کا ایک شعر ہے :-

ان لبوں کیلئے مٹی سے مری جام بنا　　شکر ہے کام مرا گردشِ ایام بنا

شیخ علی حزیں لاہجی یہی خیال یوں ادا کر گیا ہے :-

در میکدہ خاکم را پیمانہ کنی یارب　　شاید دل حسرت کش لب را بہ لبے وارد

صفیر اور حزیںؔ میں اگر کوئی فرق ہے، تو صرف اس قدر کہ ایک نے اُردو میں کہا ہے، اور دوسرے نے فارسی میں، صفیر کی مٹی سے زمانہ نے پیمانہ بنا کر ان کو معشوق کے لب لعلیں سے ملا دیا، اور حزیںؔ ابھی اس کی تمنا میں ہیں۔

صفیر فرماتے ہیں :-

یہ نونِ نیستی کی خبر پیری میں ہے شیخ　　ابتو الف سا قد ترا ہمشکل نوں ہوا

مطلب یہ ہے کہ شیخ کو پیری نے سرو قد سے جو حرف الف کے مشابہ تھا اب جھکا کر نون کی شکل کا بنا دیا اور یہ "نون" گویا "نیستی" کا حرف اول ہے، اس سے شیخ کو سمجھنا چاہیئے کہ اس کے آخری دن آ گئے، اس کے قبل بیدلؔ یوں کہہ گیا ہے :-

نقش پیری نفی ہستی می کند ہشیار باش　　صورت قد دوتا آئینہ ترکیب لا ست

یعنی بوڑھاپے میں جُھک جانا گویا لفظ "لا" کی صورت بنجانا ہے، اس لئے پیری کا جھکا ہوا قد ہستی کی نفی ہے۔

صفیر کا ایک شعر ہے :-

اے دل مجھے تو عشق میں تو خاک کر چلا　　او خانماں خراب بتا اب کدھر چلا

عرفیؔ کہتا ہے :-

بلائے دیدۂ دل راز پے شنتا بانم　　کسے نہ گویدم اے خانماں خراب کجا

کسی قدر لفظی رد و بدل کے ساتھ صفیر اور عرفیؔ کا مرکزی تخیل اور بعض فقرے باہم ملجاتے ہیں۔

صفیر کا ایک مطلع ہے :-

سرد تیرے چہرے سے ہو گرمی بازار شمع　　اک گل پژمردہ ہو گویا گل بے خار شمع

صفیر شمع کی ضو فشانیوں کو محبوب کے چہرے کے آگے ماند بتاتے ہیں گویا شمع کی روشنی محبوب کے چہرۂ منور کے نزدیک ایک "گل پژمردہ"

ہے، بالکل یہی تخیل حزیں کے ایک شعر میں بھی موجود ہے:-

گرہ سازو زبان شعلۂ شمع انجمن پیرا دراں محفل کہ حرفے زاں عذار آتشیں باشد

لیکن قبل اس کے کہ یہ مضمون ختم کیا جائے، یہ بتا دینا ضروری ہے، کہ ان کی غزل جو "موج مے" کی ردیف میں ہے، اُردو لٹریچر میں اپنی نوع کی یگانہ چیز ہے، پہلے میرا خیال تھا کہ سید امیر حسن بدر مرحوم ہی اس مستانہ غزل کے موجد ہیں جس کی مثال خمریات ابونواس اور میکدۂ خیام میں بھی مشکل ہی سے دستیاب ہو سکتی ہے، لیکن "صفیر بلبل" کے دیکھنے سے پتہ چلا، کہ بدر مرحوم نے اپنے اُستاد کی اختراع فائقہ اور بدیعہ نگارش سے استفادہ کیا ہے۔

بدر	صفیر
گاہ خم میں گہ سبو میں، شیشہ و ساغر میں گہ	جستجو اس کو ہے کس یوسف گم گشتہ کی
منزلیں طے کر رہا ہے کاروان موج مے	گردشوں میں رات دن ہے کاروان موج مے

صفیر مرحوم نے "کاروان موج مے" کی گردشوں کا ثبوت نہیں دیا تھا، حضرت بدر نے اس کے لئے خم، سبو، شیشہ، ساغر کے ارتقائی منازل بیان کئے، اور واقعتہً بتا دیا کہ "موج مے" منزلیں طے کر رہی ہے، اور ایک وقت ایسا آئیگا جبکہ کسی کے لب میگوں سے ملجائے گی، حضرت صفیر کے یہاں "یوسف گم گشتہ" کا فقرہ بہت معنی خیز ہے، مولانا بدر اگر یہی فقرہ اپنے مصرعۂ ثانی میں چسپاں کر دیتے تو ان کا شعر زیادہ بلند ہو جاتا پھر بھی بدر کا شعر صفیر سے بڑھا ہوا ہے، کیونکہ صفیر "موج مے" کو نہ تو "کارواں" کہنے کی کوئی توجیہ پیش کرتے ہیں اور نہ "گردش" کا کوئی ثبوت

بدر	صفیر
آسماں خم ہے شفق ساغر مہ و خورشید ہیں	چشم مست ساقی خود بیں ہے کیا موج شراب
کہکشاں پر مجھکو ہوتا ہے، گمان موج مے	آنکھ کے ڈوروں پہ مجھکو ہے گمان موج مے

تشبیہات کے میدان میں حضرت بدر اپنے اُستاد سے بڑھ گئے ہیں۔

بدر	صفیر
بوسے کیا کیا میں لب ساغر کے لیتا جھوم کر	ہے ترے مینوش کے لب پر بیان موج مے
لب پہ لب مجھ سے اگر ہوتی زبان موج مے	چوستا ہوں رات دن ساقی زبان موج مے

عبدالمالک (آروی)

فلسفۂ مذہب
مذہب اسلام اور اس کے مراسم و شعائر پر تفصیلی بحث و تنقید، اگر آپ اسلام کی تقلید سمجھ کر کرنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کا مطالعہ کیجیے، بہت کم جلدیں رہ گئی ہیں۔ قیمت علاوہ محصول عہ ر
مینجر نگار لکھنؤ

مکتوبات نیاز

نیاز نوازا،

کل انتہائی سراسیمگی کے عالم میں تھا کہ مکتوب گرامی پہونچا۔ سراسیمگی صرف اس لئے تھی کہ:-

چشم ہماں، قوتِ دیدش ہماں

لیکن اس کا کیا علاج کہ ——— پردہ ڈالا ہے وہ اس نے کہ اُٹھائے نہ بنے!

بارے شکر ہے کہ آپ کی تحریر سے اضطراب کچھ کم ہوا اور اس خیال سے یک گونہ تسکین ہوئی کہ دنیا میں کچھ "دل" اور بھی ہیں جو مجھ سے زیادہ لبریز شکایت ہیں۔

میں نے متعدد بار لکھا کہ یہاں آئیں، اُن کو بھی ساتھ لائیں، تاکہ ایک بار اور ہمیشہ کے لئے دیکھ کر یکسوئی حاصل کر لی جائے لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ان کی نیت خراب ہے۔ بہرحال اب اگر کوئی تدبیر ہے تو صرف یہ کہ آپ (اور اگر نامناسب نہ ہو تو یہ فقیر بھی) دونوں ساتھ اچانک وہاں پہونچ جائیں اور اس حال میں گرفتار کر لیں کہ ان کے ہاتھ خون سے رنگین ہوں۔

یہ میں نے صرف اس لئے لکھا کہ آپ کی بیقراری یوں آپ کو چین نہ لینے دیگی، ورنہ یہاں تو اس نوع کا اضطراب ہمیشہ مایوسی ہی نظر آیا ہے اور سچ پوچھئے تو میری تسکین اسی میں ہے۔

صدیقی۔

زحمت تو ہوگی، لیکن ازراہِ بندہ نوازی اختیار کیجئے اور جس طرح ممکن ہو قاضی صاحب سے ملکر یہ معلوم کر لیجئے کہ جو اطلاع انھوں نے مجھے دی تھی، کیا واقعی صحیح ہے ——— انھوں نے مجھے متعدد خطوط لکھے، لیکن چونکہ ان کی تصدیق کسی اور ذریعہ سے نہیں ہوئی، اس لئے میں نے مناسب نہ جانا کہ محض ان کے بیان پر اعتماد کر کے اسقدر طویل سفر کی مصیبت میں مبتلا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ قبلہ قاضی صاحب کس "ڈھب" کے آدمی ہیں۔ اس لئے ممکن ہو تو دیگر ذرائع سے بھی انکے بیان کی تصدیق کر لیجئے۔ میں آپکے جواب کا منتظر ہوں اور نہایت بےچینی کے ساتھ۔

شیخ صاحب،

واللہ، آپ بھی کیا باتیں کرتے ہیں ——— میں نے توبہ ہی کب کی تھی کہ توبہ توڑنے کا الزام مجھ پر قائم کیا جائے۔ مجھے معلوم تو ہو کہ یہ آپ سے

کہا کس نے، وہ کونسا "دشمنِ جاں" دوست ہے جس نے آپ کو یہ باور کرا دیا۔ استغفراللہ!

بہر حال آپ مطمئن رہئے کہ اگر "خونِ دل" پینے کا نام آپ کے یہاں بادہ خواری ہے تو

فتوائے مے زساقیِ کوثر گرفتہ ایم

میں وہاں اب بھی روز جاتا ہوں، اس سے پہلے بھی جاتا تھا، آیندہ کے متعلق بھی مجھے یقین ہے، آپ کو باور نہ آئے، یہ آپ کی بزرگی ہے، حقیقت یہی ہے کہ:۔

ما ہمانیم و ہمہ مستی ہر روزہ ہماں

قبلہ گناہ دو قسم کے ہوا کرتے ہیں، ایک وہ جسے "دعوتِ برگ و نوا" کہتے ہیں اور دوسرے وہ جو "لذتِ جگر خواری" سے آگے نہیں بڑھتے۔ معلوم نہیں آپ نے مجھے کس معصیت کا مرتکب قرار دیا ہے۔ میری بے سرو سامانی و آشفتہ حالی کا جو عالم ہے وہ آپ سے بھی مخفی نہیں کہ:۔

مرا در دہر پنداری وطن نیست

اس لئے ظاہر ہے کہ اُس گناہ تک میری دسترس کہاں جو "اربابِ توکل" کے لئے "میر ساماں" بن جاتا ہے۔ رہگیا صرف "دل کا خون کرنا" سو بتائیے کہ وہ کونسی بڑی سی بڑی عبادت ہے جو نتیجہ کے لحاظ سے اس تحت میں نہیں آتی، فرق اگر ہے تو صرف "محرابِ مسجد" و "محرابِ ابرو" کا اور یہ منحصر ہے ذوق پر۔

تو و زاہد و ہوشے و کنارِ امن گوشے
من و لغزشے و سیلِ نمِ چشم مے فروشے

معاف فرمائیے، اس سے مقصود نہ آپ کے خلوص کو صدمہ پہونچانا ہے، اور نہ آپ کو دعوتِ معصیت دینا بلکہ صرف

نوحہ بر خویش و بے نوائیِ خویش

لیکن اگر آپ کو یہ بھی ناگوار ہے تو میں معذرت کے لئے بھی طیار ہوں مگر صرف اس حد تک کہ

ز آیندہ نا اُمیدم و از رفتہ شرمسار

جانِ نیاز،

خدا کے لئے کچھ تو کہو کہ یہ سکوت میری کس "ہرزہ سرائی" کا انتقام ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آج کل تم کس کی معیت میں ہو اور اسنے کیسے زبردست "فریبِ جلوہ" سے تمھیں مسحور کر رکھا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تم اس سے ملنا ترک کردو، ملو اور ضرور ملو،

لیک، رہبر راشناس از راہزن

تمھاری عمر سے تو نہیں لیکن تمھاری فراست و دانائی سے ضرور بعید تھا کہ اتنے بدحواس ہو جاؤ گے۔

ہرچند اس عمر میں زیادہ "ہوش گوش" مجھے بھی اچھا نہیں معلوم ہوتا اور یہ سن ہی جان پر کھیل جانے کا ہے، لیکن مرنے کا لطف "مار رکھنے" ہی میں ہے، اور جہاں تم یہ کھیل کھیل رہے ہو، وہاں اسکی توقع نہیں۔

بہرحال اگر ممکن ہو تو چند دن کے لئے یہاں آجاؤ، پندِ بزرگانہ سننے کے لئے نہیں بلکہ کوچۂ عشق کی راہیں سیکھنے کے لئے، ٹھوکریں کھانے کا سلیقہ حاصل کرنے کے لئے — اور اگر جی چاہے تو یہ سننے کے لئے کہ:-

اے تماشا گاہِ عالم روئے تو
تو کجا بہرِ تماشہ می روی

کل شام کو آپ کے برادرِ نسبتی شاہ صاحب کا ایک پیام لائے — پیام تو خیر میں نے سنا یا نہیں سنا، لیکن یہ حیرت ابتک دور نہیں ہوئی کہ شاہ صاحب سے آپ کو یا میاں زاہد کو کیا واسطہ — میں نے اُن سے تو پوچھا نہیں، لیکن آپ سے پوچھتا ہوں کہ یہ کیا قصہ ہے — کیا اس دوران میں آپ دہلی گئے تھے یا شاہ صاحب خود بریلی آئے تھے

اگر آپ واقعی اُن کے مُرید ہو گئے ہیں تو خدا کے لئے مجھ سے کہدیجئے کیونکہ اُن کے کرامات کا تو میں عرصہ سے قایل تھا لیکن، یہ بات کبھی میرے وہم و گمان میں بھی نہ آسکتی تھی کہ اُن کے "فتراکِ روحانیت" میں آپ بھی کبھی صیدِ زبوں کی حیثیت سے گرفتار نظر آئیں گے۔

بہرحال اگر یہ صحیح ہے تو سوائے صبر کے کیا چارہ ہے، لیکن میں تو ایکبار آپ کی زبان سے سنکر "منزلِ الیقین" تک ابھی پہونچ جانا چاہتا ہوں - آپ کے پیر تو اس درجہ تک آپ کو جب پہونچائیں گے، پہونچائیں گے۔

عزیزِ مکرم -

اس میں شک نہیں کہ غالب کا جو شعر آپ نے لکھا ہے وہ نہایت پاکیزہ ہے اور جذبۂ رشک کا اظہار جس انداز سے کیا گیا ہے وہ گوناگوں کیفیات اپنے اندر لئے ہوئے ہے، لیکن یہ کہنا کہ غالب اس خیال میں بالکل منفرد نظر آتا ہے، غالباً درست نہیں۔

غالب[1] کے شعر میں دو ٹکڑے نہایت پاکیزہ ہیں۔ پہلے مصرعہ میں "دیکھنا قسمت" اور دوسرے مصرعہ میں "کب مجھ سے دیکھا جائے ہے"۔ اس میں زیادہ لطیف شاعرانہ خوبی اس لئے پیدا ہو گئی ہے کہ "دیکھنا" دو علیحدہ علیحدہ معنوں میں استعمال ہوا ہے - ایک جگہ "نظر کرنے" کے مفہوم میں اور دوسری جگہ "گوارا کرنے" کے معنی میں — اس وقت فارسی کا ایک شعر یاد آگیا، اسے بھی سُن لو:-

در محبت بسکہ جانِ مرا از رشک سوخت
آنکہ بر رویش نظر بسیار نتوانست کرد

---

[1] غالب کا پورا شعر یہ ہے:- دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

اس کے دوسرے مصرعہ میں جو کیفیت ہے اس کا غالب کے شعر میں کہیں پتہ نہیں ۔ یہ شعر میرزا مظہر کا ہے جو غالب سے بہت متقدم العہد تھے ۔ غالب کے سامنے یہ شعر تھا یا نہیں، اس کا علم کسے ہو لیکن دونوں کا فرق تو کوئی چھپی ہوئی چیز نہیں ۔

شعر کے محاسن جن کا تعلق صرف وجدان سے ہے، کبھی بیان میں نہیں آسکتے، لیکن جانتا ہوں کہ تم مانو گے نہیں، اس لئے مختصراً عرض کرتا ہوں ۔

غالب کہتا ہے کہ :۔ "قسمت کی خوبی دیکھئے کہ محبوب کو دیکھنے کے بعد خود مجھے اپنے آپ پر رشک آنے لگتا ہے اور اس لئے میں اسے اب دیکھ بھی نہیں سکتا"

میرزا مظہر نے پہلے مصرعہ میں لفظ بیشتر کہکر دوسرے مصرعہ میں اس کو جس خوبی سے پھیلایا ہے، وہ شاعرانہ بلاغت کی انتہا ہے ۔ غالب کے یہاں تو معاملہ صرف اس حد تک پہونچکر ختم ہوگیا کہ از راہ رشک وہ محبوب کی طرف نہیں دیکھ سکتا ۔ میرزا مظہر ایک منزل اور آگے بڑھ گئے یعنی باوجود اس رشک کے بھی اُن کو اپنے دل پر قابو نہ تھا جسے لفظ بیشتر سے ظاہر کیا گیا ہے ۔ علاوہ اس کے میرزا مظہر نے رشک کی تخصیص نہیں کی جس سے مفہوم زیادہ وسیع ہوگیا اور غالب کی سی تخصیص " انا ولا غیری " باقی نہیں رہی ۔ پھر دوسرے مصرعہ کا انداز بیان تو جس قیامت کا ہے، اس کے اظہار کی ضرورت نہیں ۔

آپ بھی کیا داستان لے بیٹھے ۔۔ اے حضرت، آجکل کافر و مسلمان دونوں کا ایک حال ہے، نہ اُسکو شیوۂ کافری کا پاس نہ اِسکو آئین مسلمانی کا لحاظ ۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ :۔

چراغِ کعبہ و بتخانہ بے پروانہ می سوزد

دنیا بدل گئی، اس کا تمدن بدل گیا، عورت مرد ہوگئی، مرد عورت بن گیا اور آپ کو ہنوز اس پر اصرار ہے کہ ریش دراز بھی ہو اور منت کش شانہ بھی !

....

دین و مذہب کے باب میں غالب اپنا فلسفہ ان الفاظ میں ظاہر کرتا ہے :۔

سنگ و خشت از مسجد ویرانہ می آرم بہ شہر
خانہ در کوئے ترسایاں عمارت می کنم

یعنی اگر کسی مذہب میں یہ قوت باقی نہیں رہی کہ وہ نظام تعمیری کو قائم رکھ سکے، تو مناسب یہی ہے کہ اس کی ویرانی پر کسی اور زندہ مذہب کی تعمیر شروع کی جائے ۔

اب مذہب نام ہے صرف سیاست کا اور سیاست کی غایت ہے صرف صنعت و تجارت کی ترقی، اس لئے اگر آپ کو واقعی مذہبی نزاع سے دلچسپی ہے تو سرمایہ داری کی حمایت کیوں نہ کیجئے کہ تاریخ مذہب کے باقیات میں سے اب یہی ایک چیز دنیا کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے ۔ اب زمانہ " حیّ علی الصلوٰۃ " کی پکار کا نہیں بلکہ " حیّ علی العمل " کا ہے ۔

راہے کہ خضر داشت ز سرچشمہ دور بود
لب تشنگی ز راہ دگر بُردہ ایم ما

لیکن آپ کیوں سمجھنے لگے ؟

آپ تو وعدہ کرنے سے کبھی تھکیں گے نہیں، لیکن یہاں پیمانۂ صبر بالکل لبریز ہوچکا ہے۔ آپ کی محبت میں زیادہ سے زیادہ مجھے وہی مرتبہ حاصل ہوسکتا ہے جو قیس عامری کو لیلیٰ کے عشق میں حاصل تھا، لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ لیلیٰ کے جھوٹے وعدوں سے تنگ آکر ایک دن غریب مجنوں کو بھی اونٹ کی مہار پکڑ کر آخر کار یہ کہدینا ہی پڑا کہ :۔

بدار اے ساربان محمل زمانے
کہ عہدِ وصل را آخر زمان ست

اس لئے پیشتر سے آگاہ کئے دیتا ہوں کہ اس مرتبہ بمبئی جاتے ہوئے آپ میرے پاس نہ ٹھہرے تو خیر مجنوں والی حرکت تو ممکن نہیں کیونکہ فرق اونٹ اور انجن کا ہے، لیکن بغداد ہیں پہونچکر ایک ہنگامہ برپا کردوں گا اور آپ کی ایک معذرت نہ سنوں گا۔ ہاں تو بتائیے، آپ کس تاریخ کو وطن چھوڑیں گے ؟

عجیب عقلمند انسان ہو۔ میں نے یہ کب لکھا تھا کہ تم خود اُن سے ملو اور معاملہ کو خراب کردو۔ مدعا تو یہ تھا کہ تمہارے حالات ان تک پہونچ جائیں اور پھر دیکھا جائے کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ خیر، اب میں کوئی اور تدبیر سوچوں گا، لیکن اگر تم نے پھر اپنی حماقت سے کوئی رخنہ پیدا کردیا، تو۔ ؟

اپنے عمو جان سے میرا سلام کہو اور پوچھو کہ انھیں کچھ خبر ہے مجھ پر کیا گزر رہی ہے، وہ یہ سُنکر غالباً صرف ہنس دیں گے۔ لیکن مجھے تم یہ لکھنا نہیں۔

آؤ، آؤ، اور تمام ان محشر سامانیوں کے ساتھ آؤ جو قدرت نے صرف تمہارے لئے مخصوص کردی ہیں،

اے گرد راہِ تو بہ جہاں نوبہار من

لیکن اس کے کیا معنی کہ آنے سے قبل ہی تم نے اپنی واپسی کی تاریخ بھی متعین کردی۔

نیاز

شوبنہار —— فلسفۂ شوپنہار پر ایک بے مثل تبصرہ قیمت ۸؍ (علاوہ محصول)
مثنوی زہر عشق —— مجلد معہ رنگین تصاویر تین مقدمات۔ قیمت ۸؍ (علاوہ محصول)
منیجر نگار لکھنؤ

کُسم

(۱)

پھاگن کا مہینہ تھا اور چاند اپنی پوری روشنی کے ساتھ چمک رہا تھا، چاندنی پرسکون فضا میں ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے چل رہے تھے، آم میں بور آچلا تھا اور اس کی مہک سے تمام ہوا معطر تھی، پپیہا جو تالاب کے کنارے ایک پرانے لیچی کے درخت کے سبز پتوں کے جھنڈ میں کہیں چھپا بیٹھا بول رہا تھا اور اس کی آواز قریب ہی کے ایک مکان میں بھی پہونچ رہی تھی، اس مکان میں رات تو تھی، لیکن نیند کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اس وقت ہمنتا اپنی خوبصورت بیوی کے ساتھ ہنسی مذاق میں مصروف تھا، وہ کبھی مضطربانہ اس کی لٹ اپنی اُنگلی میں لپیٹ لیتا کبھی اس کی چوڑیوں سے کھیلنے لگتا اور کبھی اس کے بالوں میں لپٹے ہوئے ہار کو کھینچتا اور اس کے چہرے پر لٹکا دیتا اسوقت وہ اس شبنم کے سے خمار و کیف میں ڈوبا ہوا تھا جو پھولوں کو گدگداتی ہے، اُن سے کھیلتی ہے، اور اُن کو پریشان کرتی ہے تاکہ وہ ہوشیار ہو جائیں۔

لیکن کُسم بے حس و حرکت اور ساکت بیٹھی رہی، وہ کھلی ہوئی کھڑکی سے باہر کی طرف چاندنی کی اِس پرسکون کیفیت کو دیکھ دیکھ کر مست ہو رہی تھی، اور اس کے شوہر کی ساری دلچسپیاں اس کے سکوت میں ڈوب کر رہ جاتی تھیں۔

آخر کار ہمنتا نے اپنی بیوی کے دونوں ہاتھ پکڑ کر ہلائے اور نرمی سے کہا۔ "کہاں ہو کسم تم اتنی دور چلی گئی ہو کہ اگر ایک بڑی دوربین لیکر بھی تم کو نہایت غور اور اطمینان سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ تم صرف ایک پہاڑ کی چوٹی ہو۔ ذرا میرے قریب آؤ۔ دیکھو یہ رات کس قدر خوشگوار ہے!"

کُسم نے فضا کی لامحدود وسعتوں کی طرف سے سر اپنے شوہر کی طرف پھیرا اور آہستہ سے کہا:۔ "مجھے ایک ایسا منتر معلوم ہے جو ایک لمحہ میں بہار کی اس خوشگوار رات اور چاند کو ٹکڑے ٹکڑے اور منتشر کر سکتا ہے"

ہمنتا نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اس کو زبان پر مت لانا، لیکن اگر تمھارے منتر ایک ہفتہ میں تین یا چار تعطیلیں پیدا کر سکتے ہیں اور رات کو دوسرے دن ۵ بجے شام تک طول دے سکتے ہیں، تو منتر ضرور پڑھو"

کُسم نے اپنے آپ کو اور دور کرتے ہوئے کہا، "تم کو معلوم ہے؟ آج رات کو میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہو رہی ہے کہ میں تم سے آج وہ بات کہدوں جس کو میں نے اپنے بستر مرگ پر تم سے کہنے کا وعدہ کیا تھا۔ آج رات کو مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ تم جو سزا بھی مجھے دو میں اس کو برداشت کر سکتی ہوں"

ہمنتا اس سزا کو مذاق میں اُڑانے والا تھا، اور وہ کوئی شعر پڑھنے ہی والا تھا کہ اُسے جوتوں کی چاپ قریب آتی ہوئی سنائی دی!

اِن قدموں کی چاپ سے اس کے کان آشنا تھے، اس کا باپ بپھری سہر کر چلا آ رہا تھا، اور ہمنتا اپنے باپ کی اس آمد کا مفہوم نہ سمجھتے ہوئے بہت زیادہ پریشان ہوگیا۔ دروازہ کے باہر کھڑے ہو کر اس کے باپ نے چلاکر کہا۔ "ہمنتا اپنی بیوی کو فوراً باہر نکال دو"۔

ہمنتا نے اپنی بیوی کے چہرہ پر نظر ڈالی، لیکن اس میں کسی استعجاب وحیرت کے آثار نظر نہ آئے۔ اس نے اپنے معصوم چہرہ کو اپنے دونوں نازک ہاتھوں سے چھپا لیا گویا وہ یہ چاہتی تھی کہ یہیں بیٹھے بیٹھے زمین میں سما جائے ـــــ پپیہا اپنی "پی کہاں" کا جگر سوز راگ بلند کر رہا تھا۔ لیکن کسی نے اس کی طرف توجہ نہ کی، دنیا کے محاسن لامحدود ہیں لیکن افسوس ہے کہ ہر شے کس قدر جلد تبدیل ہو جاتی ہے۔

(۲)

باہر سے واپس آکر ہمنتا نے اپنی بیوی سے پوچھا۔ "کیا یہ سچ ہے؟"

"بیشک"، کسُم نے جواب دیا۔

"تم نے مجھ سے اب تک اس کو کیوں چھپا رکھا"

"میں نے کئی بار کہنے کی کوشش کی لیکن ہر دفعہ آواز میرے حلق میں اٹک جاتی تھی، میں ایک بدنصیب عورت ہوں"۔

"تو پھر سب کچھ صاف صاف بیان کر دو"۔

کسُم نے اپنی داستان، انتہائی متانت وسنجیدگی کے ساتھ بیان کر دی، ایسا معلوم ہوتا تھا، کہ وہ ننگے پاؤں انگاروں پر سے آہستہ آہستہ گزر رہی ہے اور کوئی اس بات کا احساس نہیں کرتا کہ وہ کس قدر جُھلس گئی ہے، اس کی کہانی سُنکر ہمنتا اُٹھا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

کسُم نے سوچا کہ اس کا شوہر چلا گیا ہے، اور اب کبھی لوٹ کر نہ آئے گا یہ بات اس کو تعجب خیز نہیں معلوم ہوئی۔ اُس نے اس واقعہ کو بھی روزمرہ زندگی کے ایک غیر معمولی واقعہ سے تعبیر کیا۔ اس کا دماغ صرف چند لمحوں کے اندر اس قدر معطل ہوگیا تھا کہ اُس کو دنیا ابتدا سے انتہا تک بالکل خلا معلوم ہوتی تھی اور اُن باتوں کی یاد جو اس کے شوہر نے گزشتہ زمانے میں اُس سے کی تھیں، اُس کے حسین لبوں پر ایک خشک، افسردہ اور بے کیف تبسم کے سوا اور کچھ پیدا نہ کر سکی۔ شاید اسوقت وہ یہ سوچ رہی تھی کہ وہ محبت جو ایک انسان کی زندگی پر اس قدر چھائی ہوئی تھی اور جو اپنے ساتھ اس قدر چاہ اور عمیق احساسات لائی تھی اور جس کی وجہ سے ایک لمحہ کی جدائی بھی انتہائی تکلیف دہ، اور ایک لمحہ کی ملاقات انتہائی مسرت اور لطف آفریں معلوم ہوتی تھی جس کی وسعت لامتناہی اور جس کی زندگی دائمی معلوم ہوتی تھی ـــــ کیا وہ اس قدر نازک بنیاد پر قائم تھی، صرف چند لمحے قبل، ہمنتا نے اس سے کہا تھا۔ "کیسی خوشگوار رات ہے"۔ وہ رات ابھی ختم نہ ہوئی تھی، وہی پپیہا ابتک "پی کہاں" کا راگ الاپ رہا تھا اور وہی نسیم جانفزا کمرے کے پردوں کو حرکت دیتی ہوئی چل رہی تھی اور وہی چاندنی کھڑکی کے باہر ایک تھکی ہوئی ملکہ کی طرح محوِ خواب تھی۔ لیکن یہ سب کچھ غیر حقیقی تھا ....؟

(۳)

دوسرے دن صبح کو ہمنتا، افسردہ ومضمحل پیارے شنکر گھوسال کے گھر پہونچا۔ اور اس کو آواز دی۔ "میرے لڑکے کیا خبر لائے ہو؟"

پیارے شنکر نے اُس سے کہا۔

ہمنتا نے ایک بھڑکتی ہوئی آگ کی مانند تھرتھراتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "تم نے ہماری ذات میں بٹا لگا دیا۔ تم ہمارے لئے تباہی کا باعث ہوئے ہو، اور اب تم کو اسکا معاوضہ ادا کرنا پڑیگا۔" اُس نے اور کچھ نہ کہا۔ اس کی آواز حلق میں اٹک گئی۔

"اور تم نے شاید میری ذات کو بچا لیا اور اُس سے میرے اخراج کو روک لیا۔ اور مجھے پیار سے تھپکا اور دلاسا دیا؟" پیارے شنکر نے طعن آمیز تبسم کے ساتھ جواب دیا۔

ہمنتا کا دل، اس وقت یہ چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے برہمنی غیظ و غضب کی آگ سے پیارے شنکر کو جلا کر راکھ کر دے۔ لیکن وہ اپنے غصہ کی آگ میں خود ہی جل گیا۔ پیارے شنکر اُس کے سامنے مسرور اور مطمئن بیٹھا رہا۔

"کیا میں نے تم کو کبھی کوئی نقصان پہونچایا ہے؟" ہمنتا نے شکستہ لہجہ میں پوچھا۔

"مجھے صرف ایک سوال کرنے کی اجازت دو۔" شنکر بولا۔ "میری بیٹی —— میری تنہا اولاد —— اس نے تمہارے والد کو کیا ضرر پہونچایا تھا؟ تم اس وقت بہت کمسن تھے اور شاید اس کے متعلق کچھ نہ سنا ہو۔ لیکن اب سنو۔ اور ٹھنڈے دل سے غور کرو، میں جو کچھ اب تم سے کہنے جا رہا ہوں اُس میں تھوڑی سی ظرافت بھی ہے۔"

"تم بہت چھوٹے تھے جب میرا داماد، نابکر کنت، میری بیٹی کا بہت سا زیور چرا کر انگلستان بھاگ گیا۔ تم کو گاؤں کا وہ ہنگامہ یاد ہوگا جو اُس کے انگلستان سے پانچ سال کے بعد بیرسٹر ہو کر آنے پر مچا تھا یا شاید تم کو اس امر کی اطلاع نہ ہوئی ہو۔ کیونکہ اس وقت تم کلکتہ میں اسکول میں تعلیم پا رہے تھے۔ تمہارے والد نے اپنے آپ کو، ساری ذات اور برادری کا سرگروہ سمجھ کر یہ اعلان کر دیا کہ اگر میں اپنی بیٹی کو اسکے شوہر کے گھر بھیجوں تو مجھے اپنی بہبودی کی خاطر اُسے یکلخت چھوڑ دینا چاہیے۔ اور پھر کبھی اپنے گھر آنے کی اجازت نہ دینی چاہیئے۔ میں تمہارے باپ کے قدموں پر گر پڑا۔ اور اُس سے التجا کی۔ "بھائی۔ مجھے اس مرتبہ معاف کرو۔ میں اپنے داماد کی اس غلطی اور قصور کا کفارہ ادا کرنے کو تیار ہوں۔ براہ کرم اس کو ذات میں شریک کر لو۔" لیکن تمہارا باپ پتھر کی مانند بے حس و حرکت کھڑا رہا اور ٹس سے مس نہ ہوا۔ لیکن یہ میرے امکان میں نہ تھا۔ میری پدرانہ محبت مجھے اس بات کی اجازت نہ دیتی تھی کہ میں اپنے بیٹے کو عاق کر دوں۔ چنانچہ اپنے وطن اور عزیزوں کو خدا حافظ کہہ کر میں کلکتہ چلا گیا۔ لیکن مصائب نے وہاں بھی میرا پیچھا نہ چھوڑا۔ جب میں اپنے بھتیجے کی شادی کے تمام انتظامات مکمل کر چکا تو تمہارے والد نے لڑکی کے والدین کو ورغلا کر یہ نسبت چھڑا دی، اس وقت میں نے قسم کھائی کہ اگر میری رگوں میں برہمنوں کے خون کا ایک قطرہ بھی موجود ہے تو میں اس کا انتقام ضرور لوں گا۔ اب میرا خیال ہے کہ یہ معاملہ تمہاری سمجھ میں بخوبی آگیا ہوگا، کیوں؟ لیکن ذرا تامل کرو۔ جب میں تم سے پوری داستان بیان کر دوں گا تو تم کو اور زیادہ اس میں لطف آئے گا۔ یہ بڑا دلچسپ قصہ ہے۔

جب تم کالج میں پڑھتے تھے تو تمہارے مکان کے قریب ایک شخص بپرداس چٹرجی رہتا تھا، خدا اُس کے گناہوں کو معاف کرے۔ وہ اب مر چکا ہے۔ اس کے مکان میں ایک جوان بیوہ کسم نامی رہتی تھی۔ وہ ایک کایستھ خاندان کی یتیم لڑکی تھی، لیکن تھی بہت سُندر۔ اور اس لئے بوڑھے برہمن نے اس کو کالج کے طلبا کی حریص نگاہوں سے محفوظ رکھنے کی حتی الامکان کوشش کی۔

لیکن ایک جوان لڑکی کے لئے، بوڑھے سرپرستوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنا دشوار کام نہ تھا - چنانچہ وہ اکثر، اپنے گیلے اور بھیگے کپڑوں کو چھت پر پھیلانے کی غرض سے جاتی تھی - اور مجھے یقین ہے کہ تم نے بھی اپنی چھت کو مطالعہ کے لئے بہترین مقام سمجھا تھا - میں نہیں کہہ سکتا کہ آیا چھت پر تم دونوں ایک دوسرے سے باتیں کرتے تھے یا نہیں - لیکن لڑکی کے طرزِ عمل سے اُس کے بوڑھے سرپرستوں کے دلوں میں شبہات پیدا ہونے لگے - وہ خانہ داری کے فرائض کی تکمیل سے جی چُرانے لگی - اور پاربتی کی طرح اپنے خیالات میں اس قدر مستغرق رہنے لگی کہ رفتہ رفتہ کھانا پینا بھی بند ہونا شروع ہوا، اور نیندیں بھی حرام ہونے لگیں - بعض اوقات وہ اپنے سرپرستوں کی موجودگی میں بلا سبب رونے لگتی تھی -

"آخرکار اس نے تم دونوں کو، اکثر چھت پر ایک دوسرے کو جھانکتے ہوئے دیکھا اور بعض اوقات تم کالج بھی نہ جاتے تھے اور کتاب ہاتھ میں لئے چھت پر بیٹھے رہتے تھے - اور مطالعہ اور تعلیم سے بھی اچانک طور پر غفلت برتنے لگے تھے - پیرداس میرے پاس مشورہ کی غرض سے آیا - اور مجھ سے پوری داستان، بے کم و کاست بیان کردی - میں نے اس سے کہا - "تم کو ایک مدت سے بنارس جاترا، جانے کی خواہش ہے اسلئے بہتر ہے کہ اب تم اس خواہش کو پورا کرو، اور لڑکی کو میرے حوالہ کردو میں اس کی نگرانی کروں گا"

بوڑھا برہمن چلا گیا - اور لڑکی کو میرے سپرد کر دیا - میں نے اُس لڑکی کو سری پتی چیٹرجی کے مکان میں یہ کہہ کر رکھا کہ وہ اس کا باپ ہے - اسکے بعد جو کچھ ہوا وہ تم کو معلوم ہے - آج تم سے پوری داستان بیان کر دینے کے بعد میں انتہائی اطمینان محسوس کر رہا ہوں - اور میرے سینہ پر سے ایک بھاری بوجھ ہٹ گیا ہے - کیا یہ ایک فسانہ نہیں ہے؟ میں چاہتا ہوں کہ اس داستان کو قلمبند کر کے کتاب کی شکل میں چھپواؤں لیکن میں خود مضمون نگار نہیں ہوں - لوگ کہتے ہیں کہ میرے بھتیجے کو اس فن سے کسی قدر لگاؤ ہے - میں اُس سے کہوں گا کہ وہ اس کو میرے لئے تحریر کر دے - سب سے بہتر صورت یہ ہوگی کہ تم بھی اس کی تکمیل میں اس کا ہاتھ بٹاؤ - کیونکہ اس داستان کا انجام مجھے پوری طرح معلوم نہیں ہے"

اختتامی الفاظ کی جانب زیادہ توجہ کرتے ہوئے ہمنت نے پوچھا - "کُسم نے اس شادی سے اختلاف نہیں کیا؟"

"اس کا قیاس کرنا ذرا دشوار ہے" شنکر نے جواب دیا "تم جانتے ہو میرے لڑکے - کہ عورت کے دماغ کی ساخت کس قسم کی ہوتی ہے، جب وہ "نہیں" کہتی ہے تو اُس سے اس کا مطلب "ہاں" ہوتا ہے - دوسرے مکان میں منتقل ہونے کے بعد چند روز تک وہ تم کو دیکھے بغیر دیوانی سی ہو رہی تھی، معلوم ہوتا ہے کہ تم نے بھی اُس کے نئے مکان کا پتہ لگا لیا - کیونکہ کالج جاتے وقت تم راستہ کاٹ کر اکثر سری پتی کے گھر کے سامنے چکر لگاتے تھے، اور تمھاری نظریں، کالج کو تلاش کرنے کی بجائے ایک شریف آدمی کے مکان کی سلاخ دار کھڑکیوں میں گڑی رہتی تھیں جس میں صرف کیڑے پتنگے یا دیوانوں کی نگاہیں کچھ کامیابی حاصل کر سکتی تھیں - مجھے تم دونوں کی اس حالت پر ترس آتا تھا - میں دیکھ رہا تھا کہ تمھاری تعلیم میں ناغہ پر ناغہ ہو رہا ہے اور لڑکی کی حالت بھی ناگفتہ بہ ہو رہی ہے -

ایک روز میں نے کُسم کو بلا کر اس سے کہا - "سنو میری بیٹی - میں ایک ضعیف آدمی ہوں - اور تم کو میرے سامنے شرمانا نہ چاہئے - مجھے معلوم ہے کہ تمھارا دل اور تمھاری جان، کس کے واسطے ستی ہو رہی ہے اُس نوجوان کی حالت بھی قابلِ رحم ہے - میری یہ خواہش ہے کہ میں تم دونوں کو متحد کر دوں" یہ سُنکر کُسم کی معصوم آنکھوں سے موتی کی مانند آنسوؤں کے قطرے ڈھلک پڑے - اور وہ اپنا مُنھ چھپاتی ہوئی بھاگ گئی -

اس کے بعد میں متعدد بار سری تپّی کے گھر گیا - اور کُسُم کو بلا کر اُس سے تمھارا ذکر کیا - رفتہ رفتہ میں اپنی باتوں سے اُس کی شرم و حیا پر غالب آگیا - اور آخر کار ایک دن جب میں نے اُس سے کہا کہ میں تم دونوں کی شادی کی کوشش کروں گا تو اس نے پوچھا "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"اُس کی فکر مت کرو" میں نے جواب دیا "میں تم کو ایک برہمن لڑکی ثابت کر دوں گا" بہت دیر تک بحث مباحثہ ہونے کے بعد اُسے مجھ سے استدعا کی کہ میں اس کے متعلق تمھارا انشا معلوم کروں - "کیسی بیوقوفی کی باتیں کرتی ہو؟" میں نے کہا - "وہ لڑکا بالکل دیوانہ ہو رہا ہے ان تمام پیچیدگیوں کو اُس سے بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ پہلے شادی ہو جانے دو - اس کے بعد جو کام بخیر و خوبی ختم ہوتا ہے وہ سب اچھا ہی ہوتا ہے - اور خصوصاً جبکہ اس راز کے فاش ہونے کا ذرا بھی خطرہ نہیں ہے، کیوں راستہ سے بھٹک کر، ایک نوجوان کی ساری زندگی تباہ و برباد کی جائے؟"

مجھے معلوم نہیں کہ آیا کُسُم نے میری تجویز کی تائید کی یا نہیں - تاہم یہ بات میں دیکھتا تھا کہ بعض وقت وہ رو دیتی تھی، اور کبھی بالکل ساکت اور خاموش رہتی تھی - اور اگر میں کبھی کہتا کہ خیر اس معاملہ کو نظر انداز کر دو تو وہ بیحد مضطرب ہو جاتی تھی - جب حالات اس درجہ پر پہونچ گئے تو میں نے سری تپّی کو شادی کا پیغام دیکر تمھارے پاس بھیجا - تم نے بلا پس و پیش اس کو منظور کر لیا - اور سب کچھ طے ہو گیا -

"تاریخ مقررہ سے چند روز قبل سے، مجھے اس کو اس امر پر رضامند کرنے میں بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ اس نے انکار کر دیا تھا - وہ مجھسے برابر یہی کہا کرتی تھی "چچا اس معاملہ کو نظر انداز کر دیجئے" میں اُس سے برہم ہو کر کہتا "بیوقوف لڑکی، تیرا اس سے کیا مطلب ہے؟ جب تمام معاملات طے ہو چکے ہیں تو ہم انکار کیسے کر سکتے ہیں؟"

اس نے کہا "یہ مشہور کرا دیجئے کہ میں مر گئی ہوں اور مجھے کہیں بھیج دیجئے"

میں نے کہا "اس نوجوان لڑکے کا کیا حشر ہوگا؟ وہ اسوقت خوشی کے مارے ساتویں جنت میں پہونچ گیا ہے - محض اس امید میں کہ کل اُس کی ایک دیرینہ آرزو پوری ہو جائے گی، اور آج تم چاہتی ہو کہ میں اُس کو تمھاری موت کی خبر بھیجدوں؟ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کل مجھے اس کی موت کی خبر تم کو سُنانی پڑے گی اور اُسی روز شام کو تمھاری موت کی خبر میرے کانوں میں پڑیگی - نادان لڑکی کیا تیرا خیال ہے کہ میں اس عمر میں ایک نوجوان برہمن، اور ایک بیوہ لڑکی کو قتل کرنے کے قابل ہو سکتا ہوں؟

خوش قسمتی سے، وقت مقررہ پر شادی بخیر و خوبی، انجام پا گئی - اور اس اہم کام کی تکمیل کے بعد میں ایک بہت بڑے فرض سے سبکدوش ہو گیا - اس کے بعد جو کچھ ہوا اُس سے تم بخوبی واقف ہو"

"کیا ہم کو ایسا ناقابلِ تلافی صدمہ پہونچانے پر تم اکتفا نہ کر سکتے تھے؟" ہمنتا نے ایک مختصر سے سکوت کے بعد کہا - "تم نے اب اس راز کو کیوں فاش کر دیا؟"

انتہائی اطمینانِ قلب کے ساتھ پیارے شنکر نے جواب دیا "جب میں نے دیکھا کہ تمھاری ہمشیرہ کی شادی کے تمام انتظامات مکمل ہو چکے ہیں - تو میں نے اپنے دل میں غور کیا - کہ میں نے ایک برہمن کی ذات میں تو دھبہ لگا دیا ہے - اور یہ محض فرض کی انجام دہی کی غرض سے کیا گیا تھا - اب یہاں ایک دوسرے برہمن کی ذات بھی خطرہ میں پڑ رہی ہے اور اس مرتبہ میرا یہ اہم فرض ہے کہ میں اسکو بچا سکی

کوشش کروں - اس لئے میں نے ان کو لکھ بھیجا کہ میں دعوے کے ساتھ ثابت کر سکتا ہوں کہ تم نے ایک شودر کی لڑکی سے اپنی شادی کی ہے"

ہمنتا نے انتہائی صبر و ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "اب اس لڑکی کا کیا حشر ہوگا؟ جس کو میں چھوڑ دوں گا۔ کیا تم اس کو روٹی کپڑا دوگے؟"

"میں نے اپنا فرض ادا کر دیا" پیارے شنکر نے متانت سے جواب دیا۔ "اب یہ میرا کام نہیں ہے کہ دوسروں کی چھوڑی ہوئی اور مطلقہ بیویوں کی دیکھ بھال کرتا پھروں ---- کوئی ہے، جاؤ۔ ہمنتا بابو کے لئے برف اور شربت لاؤ۔ اور پانی بھی"

ہمنتا اٹھکر کھڑا ہو گیا اور اس خاطر تواضع کا شرمندۂ احسان ہوئے بغیر وہاں سے چلدیا۔

(۴)

چاند کی پانچویں رات تھی - اور بہت تاریک - پرندے ساکت تھے، لیچی کا درخت زمین پر ایک سیاہ داغ کے مانند نظر آرہا تھا - اور باد صرصر کے جھونکے، ایک نیند میں ڈوبے ہوئے آدمی کی طرح چل رہے تھے - آسمان پر چمکنے والے ستارے، اپنی تنویروں کو اس تاریکی میں اس لئے پیوست کئے دے رہے تھے تاکہ کوئی عمیق راز معلوم کر سکیں۔

کمرہ میں کوئی روشنی نہ تھی، ہمنتا کھڑکی کے قریب بستر پر بیٹھا ہوا تھا، اور سامنے تاریکی میں اپنی آنکھیں جمائے تھا۔ کُسم، فرش پر پڑی تھی، وہ اپنے دونوں سیمیں اور خوبصورت ہاتھوں سے اپنے شوہر کے قدموں کو مضبوط پکڑے ہوئے تھی اور اُس کا سر قدموں پر تھا۔ وقت ایک سمندر کی مانند تھا جو کامل طور پر سکوت میں ڈوبا ہوا ہو۔ رات کے صفحہ پر، معلوم ہوتا تھا کہ قسمت نے ہمیشہ کے لئے یہ ایک تصویر منقش کر دی ہے ---- تباہی ہر طرف کھڑی ہے اُس کے بیچ میں ایک منصف ہے، اور مجرم اُس کے قدموں پر سربسجود ہے۔

پھر سلیپر کی چاپ سُنائی دی، ہری ہر مکرجی نے دروازے کے قریب پہونچکر کہا۔ "بس بہت وقت ہو چکا ہے۔ اب میں زیادہ وقت نہیں دے سکتا۔ اس لڑکی کو فوراً گھر سے باہر نکالدو"

جب کُسم نے یہ آواز سُنی تو پورے جوش اور جذبات کے ساتھ ہمنتا کے پیروں سے چمٹ گئی۔ ان کو پیار کیا اور تعظیماً اپنی پیشانی اُن پر رکھدی اور پھر کھڑی ہو گئی۔

ہمنتا اُٹھا۔ اور دروازہ کی طرف بڑھ کر بولا۔ "اباجان۔ میں اپنی بیوی کو نہ چھوڑوں گا"

"کیا کہا؟" اس کے والد نے چیخ کر پوچھا۔ "کیا تو اپنی ذات کو چھوڑ دیگا؟"

"میں ذات کی پروا نہیں کرتا۔ مجھے انسانیت کا خیال ہے" ہمنتا نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"تو میں تم کو بھی چھوڑتا ہوں" اس کے والد نے کہا اور چلا گیا۔

(ٹیگور)

محشر عابدی بی۔اے

باب المراسلۃ والمناظرہ

کسبی کا دامن ایک ڈاکٹر کے ہاتھ میں

جناب ڈاکٹر محمد الیاس صاحب - ٹکاری (گیا)

نیاز صاحب!

اپنی کوتاہی فہم سے ابتک یہ سمجھتا رہا تھا کہ صرف جدت طرازی "نگار" کا حصہ ہے۔ لیکن ماہ اگست ۳۴ء کے پرچے کے مطالعہ کے بعد یہ حقیقت بھی منکشف ہوئی کہ ہر بری بات یا بالفاظ دیگر سوسائٹی کے ہر بہتر قانون کی توہین بھی اس کا طرۂ امتیاز ہے۔

کسبی والے مضمون میں فاضل مضمون نگار کی شعلہ ریزیاں دیکھ کر مجھ پر جو کیفیت طاری ہوئی وہ غصہ و رنج کی نہیں بلکہ حیرت و استعجاب کی اور حسرت و یاس کی ہے۔ اب اسے آپ یا تو میری قدامت پرستی سے تعبیر کریں یا کسی اور چیز سے لیکن مجھے کہنے دیجئے کہ جہاں جہاں علمی استدلال کا نام لیا گیا ہے بجز ابلہ فریبی کے میں اور کچھ نہیں پاتا۔ ایسے مضامین "نگار" کے صفحات کی تزئین تو کرسکتے ہیں لیکن سوسائٹی کے افراد کی عقل سلب نہیں کرسکتے۔

آپ نے جرائم کی دو قسمیں کی ہیں (۱) شخصی (۲) جماعتی۔ مجھے بھی تسلیم ہے۔ آپ کسبی کو کسی طرح کی مجرم نہیں پاتے اور میں کہتا ہوں کہ وہ دونوں طرح کی مجرم ہے۔ اول اس لئے کہ عملی دنیا میں کہیں کوئی مثال ایسی نہیں ملتی جہاں وہ حد اعتدال سے آگے نہ بڑھ گئی ہو۔ علاوہ ازیں کیا روحانیت کی موت کوئی موت نہیں ہے؟ کیا فریب کاری سے کسی کسبی کو مستثنے کیا جاسکتا ہے؟ کیا وہ پیشہ صرف اس لئے نہیں کرتی کہ دوسروں سے حصول زر کیا جائے۔

اب رہا جماعتی جرم کا سوال یہ اس سے بھی زیادہ روشن ہے، شاید آپ بھی اس سے بے خبر نہ ہوں گے کہ بدترین امراض کے جراثیم یہیں سے تقسیم ہوتے ہیں ایک دو نہیں ہزاروں خاندان کی مٹی انہیں پیشہ وروں کے ہاتھوں پلید ہوئی اور تباہی و ذلت کے جہنم میں گر کر فنا کے گھاٹ اتر گئے۔ آپ کہیں گے کہ نفس پیشہ میں کونسی قباحت لازم آتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ کسی کسبی کو آپ اس سے

مستثنےٰ کر ہی نہیں سکتے۔

عورت اور مرد کے اتصال کی جو تین غرضیں آپ نے بتلائی ہیں۔ اپنی جگہ بہت صحیح ہیں۔ لیکن آگے چلکر آپ نے جس فریب سے کام لیا ہے اللہ کی پناہ۔ یہ کیا ضرور ہے کہ "بقائے نسل" اور "تدبیر منزل" کی تکمیل تو گھریلو عورت کرتی رہے اور تیسری غرض یعنی "آلام حیات سے کسی قدر آسودگی"، کو کسی کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا جائے۔ کیوں نہ ہم یہ تینوں تمنائیں ایک ہی ذات سے وابستہ کر دیں کیا یہ تین تمنائیں اس درجہ ایک دوسرے کی ضد ہیں کہ ایک ذات سے ان کی تکمیل ممکن نہیں۔ اگر یہ حقیقت نہیں اور یقینی نہیں تو یہ تقسیم کس بنا پر ہے۔ اور اگر فرض کریں کہ اول ہی دو اغراض کی تکمیل بیویوں سے ممکن ہے تو پھر نکاح وشادی کو آپ کیوں ضروری قرار دیں۔ ان کی تکمیل تو جانور بھی کر لیتے ہیں۔ وہ بچے بھی دیتے ہیں اور ان کی پرورش بھی ہو جاتی ہے۔ بچوں کو محض ایک مرد سے موسوم کرنے کا مقصد اتنا اہم نہیں کہ اس کے لئے نکاح وشادی کا اتنا بڑا بار آج کل کے "ترقی یافتہ دماغ" کا انسان برداشت کر سکے آپ کو بھی اولیں دو اغراض کے جبلی ہونے کا اقرار ہے۔ اور رسم شادی قطعی جبلی شے نہیں۔ معلوم نہیں کہ آپ کیوں اس سے بے خبر ہیں کہ جس ہندوستان کی سوسائٹی کا ہاتھ آپ کو خون سے بہت زیادہ رنگین نظر آتا ہے وہیں کی سوسائٹی نے عورتوں کا یہ فرض قرار دیا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے اور لوازم کے ساتھ یہ بھی سیکھ لیں کہ ان کے مردوں کو کس آسائش کی ضرورت ہے۔ ان کی کونسی رنگینیاں مرد کے جمالیاتی ذوق کو پورا کر سکتی ہیں۔ ان کی کیا کیا ادائیں مرد کی طلب آسودگی کو پورا کر سکتی ہیں جس عورت میں ان کی کمی ہے وہ سب کچھ ہو سکتی ہے لیکن حقیقی معنی میں بیوی نہیں بن سکتی۔ اب یہ اور بات ہے کہ ہر عورت اس آواز پر کان نہیں دھرتی تو یہ افراد کا جرم ہے، اس سے سوسائٹی کے قانون میں کونسی قباحت لازم آتی ہے۔

آپ جس آسودگی کا نام لیکر کسی کی قربانگاہ پر انسانیت کی بھینٹ چڑھانا چاہتے ہیں اس کا کبھی سے یہاں کہیں پتہ نہیں، اسکی تمام اداؤں میں فریب۔ اس کی تمام رعنائیاں یکسر مکاری اور اس کی تمام رنگینیاں یکسر مصنوعی ہیں۔ وہ ریشمی ساری اس لئے اور محض اس لئے پہنتی ہیں کہ آپ یہ محسوس کرنے لگیں کہ اس ساری کے اندر ریشم سے بھی زیادہ نرم ونازک جسم چھپا ہوا ہے، وہ آپ کو رنگ وبو کی فضا میں صرف اس لئے لیجانا پسند کرتی ہے کہ وہاں پہونچکر آپ بہت زیادہ آسانی سے مسحور ہو جائیں اور اپنا سب کچھ اس پر نثار کرنے کو طیار۔ وہ اعضاء کے ہر لوچ کے ساتھ آپ کے دماغ کو مسلسل ایسے جھٹکے پہونچاتی ہے کہ آپ مفلوج ہو کر اپنی جیب خالی کر دیتے ہیں۔ وہ صرف تمثیل کرتی ہے عشق ومحبت کی اسی عشق ومحبت کی جو آپ کے عجیب وغریب شاعرانہ دماغ کا نتیجہ ہے یہی وہ شے ہے جس کا جادو آپ پر سب سے زیادہ چلتا ہے اور اگر یہ فن ان سے چھین لیا جائے تو پھر ان میں آپ کے لئے کوئی دلکشی باقی رہے نہ جاذبیت۔

رہی یہ بات کہ سوسائٹی کے ان تمام جذبات کراہت کے باوجود یہ پیشہ اتنا شاداب کیوں نظر آتا ہے محض ادنیٰ تدبر اس مسئلہ کو حل کر دیتا ہے۔ یہ کرشمہ ہے محض حیوانی جذبہ کا جو مرد کو ہر اس شے کے پاس کشاں کشاں لیجاتا ہے جس میں نسائیت ہو، لوچ ہو۔ رنگینی ہو اور عطریت ہو۔ آپ کو نہیں معلوم کہ ہندوستان کا مرد کتنا عجیب وغریب ہے۔ گھر کی بیویاں وہ نازو

عشوے کہاں سے لائیں جو کسبیاں صرف اسی لئے حاصل کرتی ہیں کہ مرد کو بیوقوف مرد کو دھوکا دیا جائے۔ یہاں سادگی ہے وہاں پُرکاری۔ یہاں خلوص ہے اور وہاں فریب کاری۔ بیوی ایک شریف بیوی اپنا سب کچھ شوہر کی ایک نظرِ التفات پر نثار کر دینے کو طیار ہے۔ لیکن ناکارہ مرد آسودہ ہو کر عرصہ تک فریب میں مبتلا رہنا پسند کرتا ہے۔ بعض یہی تلاش اسے وہاں لیجاتی ہے اور ہمیشہ کے لئے غرق کر آتی ہے۔

آپ نے یہ نتیجہ خدا جانے کہاں سے نکال لیا ہے کہ مرد وہ ذلیل اور کمینہ مرد جو کسبی کی گلی کی خاک چھانتا پھرتا ہے اور اسکے کوٹھے پر چڑھتا ہے سوسائٹی کی نظر میں قابل احترام رہتا ہے۔ یہ حقیقت اس طرح واضح ہو جاتی ہے کہ جب کبھی بھی وہ اس کے ارتکاب کی ہمت کرتا ہے تو ٹھیک اسی طرح جس طرح چور پلیس کی نظر سے بچکر سب کچھ کر جاتا ہے، ہاں حکومت کا قانون البتہ کسی کی طرح اس پر بھی کوئی دفعہ عائد نہیں کرتا۔

میں نے اس مضمون میں اکثر جگہ آپ کو مخاطب کیا ہے صرف اس سبب سے کہ مضمون کی اشاعت کی پوری ذمہ داری ایڈیٹر کے سر ہوتی ہے۔ اور آپ نے بغیر کسی اختلافی نوٹ کے کسبی والے مضمون کو شائع فرمایا ہے۔

مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ میری اس تحریر کی اشاعت آپ ہرگز گوارا نہیں فرمائیں گے اور مجھے اس بارہ میں کبھی آپ کا مرہون منت ہونا نہیں پڑے گا پھر بھی اپنی مجرمانہ نقاشی کی معافی چاہتا ہوں۔

(نگار) اس تحریر کی شانِ نزول یہ ہے کہ اگست سنہ ۳۴ء کے نگار میں ایک مضمون کسبی کے عنوان سے جناب بزمی بھوپالی کا شائع ہوا تھا، جس میں پیشہ ور زنان بازاری کے متعلق بہت روادارانہ انداز سے بحث کی گئی تھی اور ان کے وجود کو سوسائٹی کے لئے ایک ضرورت قبیحہ" (Evil Necessity) کے طور پر جایز ثابت کیا گیا تھا۔

محترم مراسلہ نگار کی یہ عتاب آمیز تحریر، ستمبر ہی میں مجھے ملگئی تھی، لیکن میرے حیدر آباد کے طویل قیام اور پھر جنوری کے رسالہ کی طیاری کی وجہ سے اس کی اشاعت کا موقعہ نہ ملا۔ اس دوران میں ایک سے زاید بار ڈاکٹر صاحب موصوف نے طعن آمیز تقاضے بھی کئے، لیکن افسوس ہے کہ اس سے قبل، میں اس کی اشاعت پر قادر نہ ہو سکا۔ بہرحال اب میں اس کو درج کرتا ہوں اور بتانا چاہتا ہوں کہ جس مسئلہ پر جناب بزمی نے اظہار خیال کیا تھا، اس کے لئے اسقدر رزمی انداز اختیار کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

میرا کسی مضمون کو نگار میں شائع کرنا یہ معنی نہیں رکھتا کہ میں اس کا موافق بھی ہوں۔ اس سے قبل بارہا خود میری اور میرے مسلک کی مخالفت میں مضامین موصول ہوئے اور میں نے انھیں شایع کر دیا، اس لئے مسئلہ زیر بحث میں صرف اس دلیل پر کہ میں نے بزمی صاحب کے مقالہ کی مخالفت میں کوئی نوٹ نہیں لکھا، مجھے اس کی موافقت کا مجرم قرار دینا بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ زنان بازاری کے خلاف ڈاکٹر صاحب کی برہمی کو دیکھ کر میں یہ نتیجہ اخذ کروں کہ ضرور ان کو اس پیشہ والیوں نے بہت ستایا ہے اور اسی لئے وہ یہ انتقام ان سے لے رہے ہیں۔

ہم لوگوں میں یہ سخت عیب ہے کہ اپنی مخالفت میں کوئی بات سننا پسند ہی نہیں کرتے اور یہی وہ ذہنیت ہے، جس نے ہماری نصرت

اجتماعی و سیاسی بلکہ مذہبی زندگی کو بھی ناکارہ بنا رکھا ہے۔

اگر قریشی صاحب نے کسبیوں کی حمایت میں کوئی مضمون لکھا تھا، تو اس پر غور کر کے سنجیدگی سے اس کا جواب لکھنا چاہئے تھا، برہمی کی ضرورت نہ تھی اور پھر لطف یہ کہ اظہار برہمی بھی مقالہ نگار پر نہیں ہے، بلکہ مجھ پر ہے کہ میں نے کیوں اسے شایع کیا۔ وہ آگاہ رہیں کہ دُنیا کی کوئی اصلاح اسوقت تک ممکن نہیں جب تک ریب و شک یا ایراد و اعتراض کی تمام صورتوں کو محو کر کے لوگوں کے قلوب کو متاثر نہ کیا جائے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم مخالفین کی باتیں سُنیں اور اُن کے شبہات و اعتراضات کو دور کریں۔

پیشہ ور عورتوں کا مسئلہ سوسائٹی کا نہایت قدیم مابہ النزاع مسئلہ ہے اور باوجود اس کے کہ ہمیشہ اور ہر زمانہ میں ان کے وجود کو بُری نگاہوں سے دیکھا گیا، لیکن دنیا ان سے پاک نہ ہو سکی، یہاں تک کہ حکومتوں کے قوانین بھی ادارۂ فحاشی کا استیصال نہ کر سکے اور یہ طبقہ جوں کا توں ابتک باقی ہے۔ اگر آپ نے میری تصنیف ترغیبات جنسی اب تک نہیں پڑھی تو اب مطالعہ کیجئے اور دیکھئے کہ فحاشی کتنی قدیم چیز ہے اور اس کے رواج کے خلاف کیا کیا تدابیر اختیار نہیں کی گئیں، لیکن آخر کار سب کو ناکامی کا مُنھ دیکھنا پڑا۔

میں نے جہاں تک غور کیا ہے اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ شروع سے تشخیص ہی غلط کی گئی، یعنی زنان بازاری کے استیصال سے قبل اس امر پر کبھی توجہ نہیں کی گئی کہ آیا ان کا وجود نتیجہ ہے مردوں کی آوارگی کا، یا مردوں کی آوارگی نتیجہ ہے ان کے وجود کا۔

اگر آپ نے تاریخ تمدن کا مطالعہ کیا ہو گا تو یہ حقیقت آپ سے مخفی نہ ہو گی کہ عہد وحشت میں مرد و زن کے تعلقات کیا تھے، اُس وقت نہ نکاح کا رواج تھا، نہ کسی عہد و پیمان کا، ایک مرد ایک ہی وقت میں مختلف عورتوں سے تعلق رکھ سکتا تھا اور عورت کی حیثیت اس بازاری جنس سے زیادہ نہ تھی جس کو قیمت ادا کر کے ہر وقت حاصل کیا جا سکتا ہے، چنانچہ اب بھی بہت سی قوموں میں نقد معاوضہ ادا کر کے بیوی حاصل کرنے کا دستور باقی ہے۔

اس لئے اس سے انکار ممکن نہیں کہ تعلق جنسی کے سلسلہ میں مرد کی خواہش کو ہمیشہ فایق سمجھا گیا اور عورت اس امر پر مجبور کی گئی کہ وہ مرد کی اس خواہش کو طوعاً یا کرہاً پورا کرے۔ جب تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ نکاح و ازدواج کو اصلاح معاشرت کے لئے ضروری قرار دیا گیا تو اسکے بعد بھی ایک عورت کی پابندی ضروری نہ قرار دی گئی، بلکہ اسی کے ساتھ یہ ظلم بھی غریب عورت پر روا رکھا گیا کہ وہ ایک ہی وقت میں خاندان کے مختلف مردوں سے تعلق رکھے۔ اس کے بعد جب انسانیت نے زیادہ ترقی کی تو بعض قوموں نے صرف ایک ہی بیوی کا مرد کو پابند بنانا چاہا اور بعض نے مرد کی تنوع پسند طبیعت کا لحاظ کر کے ایک سے زاید بیویاں رکھنے کی اجازت دی۔

الغرض تعلق جنسی کے سلسلہ میں عورت کی حیثیت ہر ملک اور ہر زمانہ میں حد درجہ مظلومانہ رہی ہے اور مرد کی دست درازیوں اور متعدد عورتوں سے تعلق پیدا کرنے کی تمناؤں نے ہمیشہ کسی نہ کسی صورت میں ادارۂ فحاشی کو قایم رکھا۔ پھر چونکہ صورت حال یہی تھی اس لئے رفتہ رفتہ عورتوں میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا، جن کا کام ہی یہ تھا کہ وہ مرد کی اس ناجایز خواہش کو پورا کرتی رہیں اور حکومتوں نے بھی سوسائٹی کو اس بلا سے محفوظ رکھنے کے لئے اس نوع کے ادارۂ فحاشی کا قیام جایز قرار دیا۔

بہر حال یہ واقعہ ہے کہ رواج فحاشی کی ابتدا مرد کی طرف سے ہوئی اور عورت نے اسے مجبوراً صرف اس لئے اختیار کیا کہ مرد زبردستی

اسے اس سطح پر گھسیٹ کر لے آیا تھا اور اب سوائے اس پیشے کے کوئی دوسری صورت اس کی زندگی کی باقی نہ رہی تھی۔

میرے نزدیک مرد کے اُن تمام مظالم میں جو اس نے عورت پر روا رکھے ہیں، بدترین ظلم یہی تھا اور تماشہ یہ ہے کہ اس وقت بھی جبکہ مرد اپنے آپ کو بہت آزاد و ترقی یافتہ کہتا ہے، عورت کی یہ مظلومیت اس کے نزدیک ایک ناقابل معافی جُرم کی حیثیت رکھتی ہے۔

ہمارے فاضل مراسلہ نگار ادارہ فحاشی کے سخت مخالف ہیں اور وہ زنانِ بازاری کے اتنے سخت دشمن ہیں کہ بقول شخصے اگر انھیں ملجائیں تو "کچا ہی چبا جائیں" لیکن انھوں نے اس حقیقت پر غور نہیں فرمایا کہ یہ بلا تو خود انھیں کی "ہم جنس" کی لائی ہوئی ہے اور یہ اس وقت تک دور نہیں ہو سکتی جب تک خود مرد اپنی ذہنیت میں تبدیلی پیدا نہ کرے۔

پیشہ ور عورتیں، نہایت ہی پلید قسم کی بیماریوں کا گہوارہ ہیں۔ بالکل صحیح۔ ان کے گھر بدترین اخلاقی جرائم کا مرکز ہیں۔ یقیناً درست —— ان کی عشوہ فروشیوں نے ہزاروں گھر تباہ کر دئے، لاریب فیہ —— لیکن سوال یہ ہے کہ یہ بیماریاں اُن کو کس نے لگائی ہیں، یہ اخلاقی جرائم کس کی وجہ سے قائم ہیں اور یہ مال و زر کی تباہیاں کیا اس لئے نہیں ہیں کہ مرد اپنے جذبات کا بندہ اور اپنے نفس کا غلام ہے۔

آگ کا کام جلانا ہے اور پانی کا بہا لیجانا، لیکن آپ کیوں آگ میں کودیں اور کیوں دریا کے اندر قدم رکھیں —— اگر آپ ایسا کریں گے تو دنیا آپ ہی کو بیوقوف بنائے گی، آگ اور پانی کو کوئی بُرا نہیں کہیگا۔

آپ اس طبقہ کے خلاف تو جہاد پر آمادہ ہیں، لیکن خود اپنی جماعت کی اصلاح پر متوجہ نہیں جو اصل محرک و سبب ہے فحاشی کے قیام کا۔ کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ کوئی بازاری عورت زبردستی مرد کو اس کے گھر سے گھسیٹ لے گئی ہو، کیا کبھی اس نے ایسا کیا ہے کہ وہ راہ چلتے آدمی کو جبر اپنے کوٹھے پر کھینچ لائی ہو۔ پھر جب صورتِ حال یہ نہیں ہے تو کسی کا کیا قصور۔ شراب کی کشید اسی لئے جاری ہے کہ انسان اسے استعمال کرتا ہے، افیون کی کاشت اسی لئے ہوتی ہے کہ لوگ اس کے شایق ہیں، دنیا میں ہر پیداوار طلب کے لحاظ سے ہوا کرتی ہے اس لئے پیداوار کے خلاف احتجاج کرنا سخت لایعنی سی بات ہے کیونکہ وہ تو نتیجہ ہے طلب کا۔ ہم اصل سبب کو کیوں نہ دور کریں کہ ہمیشہ کے لئے انسداد ہو جائے، ورنہ یوں اگر اصلاح ہوئی بھی تو بالکل عارضی ہوگی اور اس کا قیام پائدار نہ ہوگا۔

جو تحریک مراسلہ نگار نے کی ہے، وہ کوئی نئی چیز نہیں، اس سے قبل بعض حکومتوں نے بجبر قحبہ خانوں کو بند کرا کے سخت سزائیں پیشہ ور عورتوں کے لئے تجویز کیں، لیکن آخرکار اس میں کامیابی نہ ہو سکی اور بعد کو مانع فحاشی قوانین منسوخ کرنے پڑے —— کیونکہ ان قوانین کے نفاذ سے مردوں کے اخلاق پر تو کوئی اثر پڑا نہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اندرونی طور پر سوسائٹی کے اندر فحاشی کا رواج شروع ہو گیا جو بہت زیادہ مہلک و تباہ کن تھا۔

تنوع پسندی اور ہر جدید چیز سے لذت اُٹھانا، انسان کی فطرت ہے، اس لئے یہ ناممکن ہے کہ مرد یا عورت کے ذہن سے اس خواہش کو دور کر دیا جائے، لیکن چونکہ عورت نسبتاً زیادہ صابر و ضابط اور زیادہ شرمیلی واقع ہوئی ہے، اس لئے اس کی خواہش کو تو ہم سوسائٹی کے قوانین سے دبا سکتے ہیں لیکن مرد، جو زیادہ بیباک پیدا ہوا ہے اور رسم و رواج کے ماتحت اس کی فحاشیوں کو اتنا معیوب نہیں سمجھا جاتا، مشکل سے قابو میں آسکتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج تک انسدادِ فحاشی نہ ہو سکا۔ اور نہ عملی طور پر پیشہ ور عورتوں سے دنیا کو پاک کیا جا سکا۔

بہرحال، میں اس باب میں معزز مراسلہ نگار کا بالکل ہمنوا ہوں کہ پیشہ ور عورتوں سے ملک میں ہلاکت و تباہی پھیل رہی ہے اور ہماری معاشرت میں ان کا وجود نہایت بدنما داغ ناصیۂ انسانیت کے لئے ہے، لیکن میں اس باب میں اُن سے متفق نہیں کہ ایک وقت ایسا بھی آسکتا ہے جب دُنیا کی رونق ان کے نہ ہونے سے کم ہو جائے گی، یہ طبقہ ہمیشہ اسی طرح قائم رہیگا اور اس وقت تک کہ مرد خود اپنی فطرت میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کرے۔ (جو یقیناً محال ہے) یہی چرچے دنیا میں رہیں گے۔ انسان اگر درندہ پیدا نہیں ہوا، تو اس کے فرشتہ ہونے کا بھی کوئی ثبوت موجود نہیں، اور غالباً دُنیا کا لطف اسی پر قائم ہے۔

بیا کہ رونقِ ایں کارخانہ کم نہ شود
ز زُہدِ ہمچو توئی یا زفسق ہمچو منی !

اہتمام سرسری اطلاعنامہ بنام دائنان

(دفعہ ۴۷ ایکٹ نمبر ۵ سنہ ۱۹۲۰ء)

بعدالت جناب سید خورشید حسین صاحب جج خفیفہ لکھنؤ

درخواست دیوالیہ نمبر ۲۷ سنہ ۱۹۳۴ء

بمقدمہ قرار دئے جانے دیوالیہ مسمیٰ آتشی رام ولد کنوجی قوم تنبولی ساکن لال باغ لکھنؤ

بنام
۵ - بلہداس ساکن رستوگی ٹولہ تھانہ چوک شہر لکھنؤ
۷ - دامودر داس ساکن رستوگی ٹولہ تھانہ چوک شہر لکھنؤ
۱۲ - لالہ پرسوتم داس ولد لالہ ہرنرائن رستوگی ساکن اشرف آباد تھانہ چوک شہر لکھنؤ

اطلاع دی جاتی ہے کہ بتاریخ ۱۰ ماہ مارچ سنہ ۱۹۳۴ء مدیون مذکور الصدر نے ایک قطعہ درخواست اس عدالت میں بدیں غرض پیش کی ہے کہ وہ دیوالیہ قرار دیا جاوے اور یہ کہ بتاریخ ۱۷ ماہ مارچ سنہ ۱۹۳۴ء عدالت ہذا نے اس امر کا اطمینان کر کے کہ مدیون کی جایداد غالباً مبلغ پانچ سو روپیہ سے زائد نہ ہوگی ہدایت کی ہے کہ مدیون کی جایداد کا اہتمام سرسری طریقہ پر کیا جاوے اور تاریخ ۲۰ ماہ فروری سنہ ۱۹۳۵ء بنا بر مزید سماعت درخواست و اظہار مدیون مذکور مقرر کی ہے۔ اس امر کی بھی اطلاع دی جاتی ہے کہ عدالت تاریخ مذکور الصدر پر تصفیہ و تقسیم جایداد مدیون مذکور کی فوراً کارروائی شروع کر سکتی ہے۔ تم کو اختیار ہے کہ تم حاضر ہو کر اُس تاریخ پر ثبوت دو۔ ثبوت کسی دعویٰ کا جو تم کرنا چاہو تاریخ مذکور پر یا اُس کے قبل داخل عدالت کرنا لازمی ہوگا۔

میرے دستخط اور مہر عدالت کے آج بتاریخ ۲۳ ماہ جنوری سنہ ۱۹۳۵ء جاری کیا گیا۔

دستخط جج بخط انگریزی

وقت حاضری عدالت دس بجے سے چار بجے تک

چند دلچسپ نتائجِ مطالعہ

چینیوں کا جہنم ——

ہر مذہب میں خواہ وہ قدیم ہو یا جدید، وثنی ہو یا غیر وثنی، معاد کا اعتقاد ضرور پایا جاتا ہے اور اس سلسلہ میں جنت و دوزخ کے جو حالات بیان کئے جاتے ہیں، ان میں ہر جگہ عجیب و غریب شاعری سے کام لیا گیا ہے، جو ہر ملک کے ماحول کے لحاظ سے کچھ نہ کچھ مختلف ہوتی ہے۔

مثلاً اگر کسی مذہب نے نہایت گرم ملک میں نشو و نما پایا ہے تو دوزخ نہایت شدید گرم ہوگی جہاں آگ کی لپٹ ہے اور بادِ سموم کے جھونکے برخلاف اس کے قطب شمالی کے رہنے والوں کی دوزخ وہ ہے، جہاں ہر وقت برفباری ہو رہی ہے اور ہر چیز یخ بستہ نظر آتی ہے۔

الغرض ہر ملک کی مدنیت اور اس کے ماحول کو اعتقادات مذہب و معاد میں بڑا دخل ہوا کرتا ہے اور اگر کوئی شخص تحقیق کرے تو مذاہب کے مطالعہ سے اہل مذاہب کی فطرت، ان کے ماحول و تمدن اور ذوقِ شاعری کا علم بڑی حد تک اسے حاصل ہو سکتا ہے۔

مثلاً چینیوں کو لیجئے کہ اُن کے یہاں جہنم کے دس یا اٹھارہ درجے قائم کئے گئے ہیں اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے تقسیم جرائم اور اسی لحاظ سے ترتیب قانون میں کافی دقّتِ نظر سے کام لیا تھا۔

ان کے یہاں جہنم کا پہلا درجہ قاتلوں، خودکشی کرنے والوں اور حیات بعد الموت کے منکروں کے لئے مخصوص ہے جس میں وہ بھوکے پیاسے رکھے جائیں گے اور روز مار مار کر زندہ کئے جائیں گے۔ چونکہ یہ تینوں زندگی کی نعمت کو ٹھکرانے والے ہیں، اس لئے سزا بھی وہی تجویز کی گئی جو ان کے مناسب حال تھی اور جس میں شاعرانہ تشبیہ و استعارہ دونوں مکمل طور پر پائے جاتے ہیں۔

دوسرا درجہ جہنم کا جھوٹ بولنے والے کے لئے ہے، اس طبقہ میں صرف ایک صحرا ہے جس کے درختوں کے پتے تلوار کی طرح تیز ہیں اور جہاں دریاؤں کا پانی چونے کا ہے۔

چونکہ جھوٹ بولنے کا تعلق زبان اور حلق سے ہے اس لئے سزا بھی وہی تجویز کی گئی جو زبان اور حلق کو تکلیف پہونچانے والی ہے۔

تیسرے درجہ میں وہ لوگ رکھے جائیں گے جنھوں نے سردارانِ قوم کا احترام نہیں کیا ہے، یہاں سوائے نمک کے اور کچھ نہ ہوگا، یہی کھائیں گے اور اسی میں زندگی بسر کریں گے، اس سزا کا بھی شاعرانہ تعلق جرم سے ظاہر ہے۔

چوتھا طبقہ ان لوگوں کے لئے ہے جو ملک کے محاصل ادا نہیں کرتے، جو ناکارہ دوائیں فروخت کرتے ہیں اور جو راستے میں کانچ کے ٹکڑے ڈال دیتے ہیں یا اپنے جانوروں کو سڑک پر آزاد چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو پتھروں اور لکڑی کے بڑے بڑے کندوں کے نیچے دبا دیا جائیگا۔

پانچواں طبقہ کافروں، ساحروں، غیبت کرنے والے، خوشامدیوں اور اپنا قرض نہ ادا کرنے والوں کے لئے ہے۔ اور چھٹا ان لوگوں کے لئے ہے جنھوں نے قربانیاں پیش کرنے میں تامل کیا تھا، یہ ایک پنجرہ میں بند کر دئے جائیں گے اور چوہے اور ٹڈیاں ان کو نوچ نوچ کر کھائیں گے اسی طرح ایک درجہ زانیوں کے لئے ہے اور ان کی سزا عجیب غریب بتائی گئی ہے یعنی ایک زانی کی شخصیت متعدد شخصیتوں میں تبدیل کر دیجائیگی اور ہر ایک پر علٰحدہ علٰحدہ عذاب کیا جائے گا۔ یہ شاعرانہ توجیہ کسقدر دلچسپ ہے۔

آپ دُنیا کے کسی مذہب کو لیجئے اس کے یہاں عذاب و ثواب کی شاعرانہ مصوری تقریباً اسی قسم کی نظر آئے گی اور اگر اس میں کوئی فرق ہوگا تو صرف اس نفسیاتی احساس کی وجہ سے جو مختلف قوموں میں اُن کے ماحول و تمدن کے لحاظ سے علٰحدہ علٰحدہ پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن اب مذہب کی شاعری کا یہ دور ختم ہو گیا ہے کیونکہ یہ زمانہ حقائق کی جستجو کا ہے اور محض ظن و قیاس پر اعتماد کر کے کسی نظریہ کی بنیاد قایم نہیں ہو سکتی۔

ترکی کی جدید اصلاحات

(۱) ۱۹۳۵ء کا آغاز ترکی میں مزید اصلاحات کے ساتھ ہوا ہے۔ جن میں سب سے زیادہ اہم اصلاح ترکی خواتین کی سیاسی اہمیت کو بڑھانا ہے۔ اس سے قبل وہ میونسپل ممبروں کے حق میں رائے بھی دے سکتی تھیں اور خود بھی ممبر ہو سکتی تھیں، لیکن پارلیمنٹ میں انکی کوئی آواز نہ تھی۔ اب حکومت نے ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے، یعنی ۲۲ سال کی عمر رکھنے والی خواتین ممبران پارلیمنٹ کے حق میں رائے دے سکتی ہیں اور ۳۰ سال کے عمر کی خود بھی پارلیمنٹ میں جا سکتی ہیں۔

(۲) ۶ سال قبل عربی رسم الخط کے بجائے لاطینی حروف کا استعمال وہاں شروع ہوا تھا اور اس تحریک کے سلسلہ میں ایک عام رجحان تعلیم کا لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو گیا تھا، لیکن اب مصطفےٰ کمال نے ترکی زبان سے عربی و فارسی الفاظ کے اخراج کا بھی تہیہ کر لیا ہے اور اس باب میں اتنا قدغن ہے کہ وہ قدیم ناموں کو بھی ترک کر رہا ہے، چنانچہ خود اسنے اپنا نام بجائے مصطفےٰ کمال کے "اتاترک" رکھا ہے جسکے معنی "ترک اعظم" کے ہیں اور اپنے وزراء کا نام بھی بدلدیا ہے۔

چنانچہ اس تحریک نے وہاں کی زبان میں بڑا تغیر پیدا کر دیا ہے اور اب وہاں کا سمر لٹریچر خالص ترکی زبان میں شائع ہو رہا ہے جسمیں غیر زبانوں کا کوئی ایک لفظ بھی نہیں پایا جاتا۔

(۳)۔ مصطفےٰ کمال نے مشرقی موسیقی کو کبھی پسند نہیں کیا۔ کیونکہ اس سے یاس و حُزن پیدا ہوتا ہے اور لوگوں کے دلولۂ عمل پر اس کا بُرا اثر پڑتا ہے۔ اس لئے اس نے حال میں احکام جاری کئے ہیں کہ مشرقی موسیقی کی آواز کسی جگہ سے بلند نہ ہو، اور جدید مغربی اُصول پر اس کو مرتب کیا جائے۔

(۴) اصلاح مذہب کے سلسلہ میں، اُس نے جدید احکام یہ جاری کئے ہیں کہ کسی مذہب کا پیشوا کوئی خاص لباس ایسا استعمال نہیں کر سکتا، جس سے اس کی مذہبی قیادت کا اظہار ہو، اس کے معنے یہ ہیں کہ نہ مسلمان علماء وہاں عمامہ و عبا استعمال کر سکیں گے

اور یہ عیسائی پادری اپنی دراز قبائیں — اس اعلان سے وہاں کی عیسائی آبادی میں ہیجان پیدا ہوگیا ہے اور پاپائے روم نے فیصلہ کیا ہے کہ ان حالات میں وہاں عیسوی مدارس کا قایم رکھنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

مغرب اور جنگ مستقبل

یقیناً اس وقت مغرب کا کوئی ملک جنگ کرنا پسند نہیں کرتا اور بظاہر دنیا میں امن و سکون پیدا کرنے کی کوشش ہر ملک کی طرف سے کی جا رہی ہے، لیکن اسی کے ساتھ بے اعتباری اور امکانِ جنگ کی طرف سے خوف کا یہ عالم ہے کہ ہر قوم اپنی ساری قوت، اسباب حرب کی طیاری میں صرف کر رہی ہے۔

حال ہی میں مغرب کی اکثر سلطنتوں نے اپنے اپنے یہاں فوجی مشقوں اور مصنوعی جنگوں کی نمائش کی تھی اور اس سلسلہ میں جو حالات معلوم ہوئے ہیں وہ آیندہ جنگ کے ہولناک مناظر کی ایسی ڈراؤنی پیشین گوئی کرنے والے ہیں کہ اگر واقعی کبھی لڑائی چھڑ گئی تو شاید کرۂ ارض کو اپنی تباہی کے لئے کسی صور اسرافیل کے انتظار کی ضرورت باقی نہ رہیگی۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ آیندہ جنگ بالکل فضائی جنگ ہوگی اور زمین کا فیصلہ ہوا میں ہوگا، لیکن اس ہوائی ساخت کی کامیابی میں سب سے بڑا مانع ایک تو جہازوں کا شور ہے جو بہت دور سے راز کو افشا کر دیتا ہے اور دوسرا یہ کہ ان کے مقابلہ میں دوسرے ہوائی جہازوں کو اُڑانے کے لئے بھی اتنا وقت درکار ہوتا ہے کہ تباہیوں کو نہیں روکا جا سکتا۔ لیکن ان مصنوعی جنگوں کی نمائش سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دشواریاں بھی دور ہو کر رہیں گی۔ کیونکہ بعض ماہرین فن نے ایسے جہاز پیش کئے جن میں شور بالکل نہیں ہوتا اور برطانیہ کی وزارت بحری نے ایسے جہازوں کا بغور مطالعہ کیا جنکی آواز ۲۰۰ فٹ سے آگے نہیں جاتی۔ اسی کے ساتھ فرانسیسی انجینئروں نے اس کا بھی امکان ظاہر کیا ہے کہ وہ چھ چھ ہزار فٹ کے بلند مینار اس وضع کے طیار کر سکتے ہیں جہاں متعدد ہوائی جہاز رہ سکیں اور ضرورت کے وقت وہیں سے بالا بالا اُڑ کر دشمنوں کے جہازوں پر بم برسا سکیں۔

فرانس نے اُڑنے والے دبابہ (Tank) کی بھی نمائش کی تھی۔ گویا یہ خاص قسم کے ہوائی جہاز ہیں جن میں نہایت سریع چلنے والی توپیں بھی نصب کر دی گئی ہیں، اسی طرح کے اور متعدد آلات حرب پیش کئے گئے جن کا استعمال مستقبل کی جنگ میں کیا جائے گا اور نہیں کہا جا سکتا کہ درندوں کی اس جنگ ناخن و چنگال میں کون غالب رہیگا اور کون مغلوب، لیکن یہ یقینی ہے کہ شہری آبادی خواہ وہ کسی غالب ملک کی ہو یا مغلوب ملک کی، بکثرت تباہ و برباد ہوگی اور اس طرح آنے والی جنگ کا بڑا کارنامہ یہ ہوگا کہ اس نے سپاہیوں سے زیادہ کتنے امن پسند شہریوں کو ہلاک کیا۔

مغرب میں تعیین اُجرت کا معیار

جس زمانہ میں ہوور امریکہ کا پریسیڈنٹ تھا، اس کی بیوی نے چھ منٹ کے لئے آلۂ نشر صوت پر تقریر کرنے کے لئے تین ہزار ڈالر

گویا فی منٹ پانسو ڈالر معاوضہ وصول کیا۔

رڈیارڈ کپلنگ مغرب کے مشہور افسانہ نویس نے اس وقت تک جتنا روپیہ کمایا ہے اس کا اوسطاً فی لفظ ایک شلنگ (تقریباً بارہ آنے) پڑتا ہے۔ چنانچہ مشہور ہے کہ ایک بار کسی شخص نے اس کے پاس ایک شلنگ کا منی آرڈر بھیجکر استدعا کی کہ ایک لفظ خط میں لکھ کر اسکو بھیجدیا جائے کپلنگ نے منی آرڈر وصول کرکے ایک کارڈ پر لفظ (Thanks) لکھ کر اس کے پاس بھیجدیا۔

آرنلڈ بنٹ کی سالانہ آمدنی سولہ ہزار پونڈ بتائی جاتی ہے، برنارڈ شا اس سے بھی زیادہ یعنی ۲۰ ہزار پونڈ سالانہ کماتا ہے۔ نوبل کوارڈ کی عمر جب ۲۷ سال کی تھی تو اس کی آمدنی ۵۰ ہزار پونڈ سالانہ تھی۔ مسز اسکوئتھ نے اپنے حالات زندگی لکھ کر تیرہ ہزار پونڈ میں فروخت کئے اور مسٹر ہٹچنسن کو اس کے مشہور ناول (If winter comes) کا معاوضہ ۳۰ ہزار پونڈ ملا۔

حال ہی میں مسٹر لائڈ جارج کو ایک پبلشر نے ۹۰ ہزار پونڈ پیش کئے کہ وہ اندازاً تین لاکھ الفاظ کی ایک کتاب لکھدے۔ سر آرتھر کینن ڈائل کو بارہ افسانوں کے لئے ۹ ہزار پونڈ دئے گئے۔ مسٹر چرچل کو بعض مضامین کا معاوضہ بحساب ۲۵۰ پونڈ فی مضمون دیا گیا۔

اس کے مقابلہ میں ہندوستان کے اہل قلم کا ذکر کیا جائے جبکہ یہاں ایک گریجوٹ کی قیمت بیس روپیہ ماہوار سے زیادہ نہیں ہے سُنا ہے کہ کسی دفتر میں کلرکوں کے لئے یہ نوٹس لکھ کر لگایا گیا کہ "ان کی تنخواہ ان کا ذاتی معاملہ ہے اس لئے اس کے اعلان کی ضرورت نہیں"۔ یہ نوٹس دیکھ کر ایک کلرک نے کہا کہ "ہم خود ہی شرم سے اس کا ذکر کسی سے نہیں کر سکتے، اس نوٹس کی ضرورت ہی کیا تھی"۔

بعض خرافات کی حقیقت

اس وقت ترقی عقل وعلم کے زمانہ میں بھی بعض عقاید ایسے پائے جاتے ہیں جو عہد قدیم کی واہمہ پرستی کی یادگار ہیں۔ مثلاً گھوڑے کی نعل کو بہت مبارک چیز سمجھا جاتا ہے اور اگر کسی کو راستہ میں پڑی ہوئی مل جائے تو سمجھا جاتا ہے کہ اس کا سارا دن بلکہ پورا سال خوشی میں بسر ہوگا بعض لوگ تفاؤل کے طور پر اسے دروازہ پر بھی لٹکا دیتے ہیں۔ ہر چند لوہے کی دریافت کو صرف ۳ ہزار سال کا زمانہ ہوا ہے اور آہنی چیزوں کی ساخت انسان کے عہد تمدن کی یادگار ہے، خصوصاً گھوڑے کی نعل کہ یہ تو بہت بعد کی چیز ہے، لیکن اس عقیدہ کا تعلق یقیناً عہد وحشت سے ہے۔

نعل کی شکل ہلال کی سی ہوتی ہے اور دنیا کی تمام وحشی قومیں رویت ہلال پر اظہار مسرت کیا کرتی تھیں، چونکہ چاندنی راتوں میں وہ درندوں اور دشمنوں کے خطرات سے محفوظ رہتے تھے، چنانچہ لوہے کی دریافت سے قبل ہڈی یا لکڑی کے چاند بنا کر اپنے پاس رکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس کی برکت سے وہ رد بلا کر سکیں گے۔ جب گھوڑے کی نعل بننے لگی تو وہ ہڈی یا لکڑی کے چاند بنانے سے بے نیاز ہوگئے اور اس کو ان کی جگہ سمجھا جانے لگا۔

بعض قوموں میں دستور ہے کہ جب بچہ کا دانت ٹوٹتا ہے تو اسے کسی بڑے درخت کی جڑ میں دفن کر دیتے ہیں اس سے ان کا

مدعا یہ ہوتا ہے کہ بچہ بھی قوت اور رفعت میں اس درخت کے برابر پہونچ جائے، ہندوستان میں عورتیں چوہے کے بل میں ڈالدیتی ہیں تاکہ ویسے ہی تیز اور چھوٹے چھوٹے خوبصورت دانت بچے کے بھی نکلیں۔ بعض قبایل میں یہ رواج اب بھی چلا آرہا ہے کہ جب لڑکا جوانی پر آتا ہے تو اس کے ایک دو دانت توڑ ڈالتے ہیں۔ اس کا تعلق بھی عہد وحشت سے ہے، کیونکہ اُس وقت جب کوئی نوجوان قبیلہ میں داخل ہونا چاہتا تھا تو اسکے ایک دو دانت توڑ کر دیکھا جاتا تھا کہ اس میں تکلیف برداشت کرنے کی اہلیت پائی جاتی ہے یا نہیں۔

اہل مغرب کے نزدیک ۱۳ کا عدد بہت منحوس سمجھا جاتا ہے، یہاں تک کہ بعض ہوٹلوں میں اس نمبر کا کوئی کمرا ہوتا ہی نہیں۔ بارہ نمبر کے بعد چودہ نمبر ڈالدیتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ (۱۳) ایسا ہندسہ ہے کہ وہ پوری طرح تقسیم نہیں ہو سکتا اور عہد وحشت کے لوگ چونکہ ریاضی سے بالکل نابلد تھے اس لئے کسور وغیرہ سے بہت گھبراتے تھے، اور وہی احتراز اب تک چلا آرہا ہے۔

انگریزی زبان کی ایک مثل ہے کہ بلّی ۹ جانیں رکھتی ہے۔ یہ واہمہ پرستی قدیم مصریوں کی یادگار ہے جو بلّی کی بڑی عزت کرتے تھے اور اسی جذبۂ احترام کی بناء پر بجائے ایک کے اُس سے ۹ جانیں منسوب کرتے تھے، ان کے یہاں ایک دیوی بھی تھی جس کا سر بلّی کا سا ہوتا تھا اور اس کو بھی نوجانوں والی دیوی سمجھا جاتا تھا۔ الغرض اہل مغرب میں یہ خیال و اعتقاد مصر سے آیا ہے۔

عورتوں میں آئینہ کا ٹوٹ جانا بری فال سمجھا جاتا ہے۔ اس کا تعلق بھی عہد وحشت سے ہے۔ قدیم انسان سمجھتا تھا کہ اس کا سایہ یا عکس بھی اسی کی ہستی کا ایک جزو ہے اور اس لئے اس کی ایذا خود روح انسانی کی ایذا ہے۔

رات کو کتے کا رونا بھی منحوس بات سمجھی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ علامت ہے کسی کے موت کی۔ اس کا تعلق بھی اہل مصر کی واہمہ پرستی سے ہے، کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ فرشتۂ موت کتے کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔

بعض قوموں میں دستور چلا آتا ہے کہ مہمان کے سامنے سب سے پہلے نمک پیش کیا جاتا ہے، اس کا تعلق بھی انسان کے عہد جاہلیت سے ہے، کیونکہ زمانۂ قدیم میں نمک نہایت نادر چیز سمجھا جاتا تھا اور اتفاق سے اگر انھیں کبھی میسر آجاتا تھا تو اس کو نہایت قیمتی چیز سمجھ کر بڑی احتیاط سے صرف کیا جاتا تھا۔ پھر چونکہ مہمان کے سامنے بہترین چیز پیش کرنے کا دستور ان میں بھی تھا، اس لئے سب سے پہلے نمک ہی پیش کیا جاتا تھا اور وہی رسم اب تک بعض قوموں میں چلی آتی ہے، چنانچہ ہندوستان میں بوہرہ قوم اس کی بہت پابند ہے۔

جاسوسی کی جدتیں

آیندہ جنگ کے امکانات کا اندازہ صرف آلات حرب کی طیاریوں ہی سے نہیں ہوتا بلکہ دوسری سرگرمیوں سے بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً گزشتہ ۲۲ مہینوں میں تقریباً چھ سو آدمی جاسوسی کرتے ہوئے ممالک مغرب میں گرفتار کئے گئے اور کہا جاتا ہے کہ اندازاً دس ہزار ماہر فن جاسوس اسوقت یوروپ میں کام کر رہے ہیں۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ اسوقت بے اعتباریاں حد سے زیادہ بڑھ گئی ہیں اور خود حلیف قوتوں کو بھی ایک دوسرے پر اعتماد باقی نہیں رہا۔

اس جگہ مختصراً یہ ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جاسوسوں کی جماعت اپنے ملکوں کو اطلاعات پہونچانے کے لئے کیسے کیسے عجیب طریقے استعمال کرتی ہے۔

سوویٹ روس کے جاسوس اپنی خفیہ اطلاعات اُبلے ہوئے انڈوں کے ذریعہ سے روانہ کرتے ہوئے پائے گئے۔ یہ انڈے معمولی انڈوں کے ساتھ ٹوکروں میں رکھ کر روانہ کئے جاتے ہیں، لیکن منزلِ مقصود پر پہونچکر جب ان کا چھلکا علحدہ کیا جاتا تھا تو اندر منجمد سفیدی پر سیاہی مایل بھورے رنگ کی تحریر نظر آتی تھی۔ اول اول تو یہ نکتے کسی طرح سمجھ میں نہ آیا کہ چھلکے کے نیچے تحریر کیونکر منقوش ہو سکی، لیکن بعد کو بہت تحقیق کے بعد دریافت ہوا کہ اگر شکر اور پھٹکری کے پانی سے چھلکے کے اوپر لکھدیا جائے تو اندر سفیدی تک پہونچکر ایک خاص رنگ اختیار کر لیتا ہے اور اوپر کوئی علامت تحریر کی نظر نہیں آتی۔

اس سے بھی زیادہ عجیب طریقہ یہ ہے کہ موزوں، سلے ہوئے کپڑوں اور کارچوب کئے ہوئے رومالوں کے ذریعہ سے پیغامات بھیجے جاتے ہیں۔ یہ پہلے سے طے ہو جاتا ہے کہ فلاں قسم کے آڑے ٹانکے یا پھول پتیاں اس مفہوم کو ظاہر کریں گے اور پھر انھیں مقررہ اصول کے مطابق چھوٹے بڑے آڑے ترچھے ٹانکے دیکھ کر مفہوم اخذ کر لیا جاتا ہے۔

انگلستان میں ایک ایسا شخص جاسوسی کی علت میں گرفتار کیا گیا جو پرانے ٹکٹوں کے جمع کرنے کا شایق تھا اور اس کے البم میں سوائے استعمالی ٹکٹوں کے اور کچھ نہ تھا۔ لیکن اسکی ترکیب یہ تھی کہ مختلف بندرگاہوں سے مختلف قسم کے ٹکٹ لفافہ میں بند کر کے اپنے ملک کو روانہ کیا کرتا تھا اور اس میں رمز یہ تھا کہ جس بندرگاہ سے خط پوست کیا جاتا تھا وہاں کے جہازوں کی تعداد اور ان کی قسموں کا پتہ ٹکٹوں کی تعداد اور قسموں سے لگایا جاتا تھا۔ چنانچہ ایک بار اس نے تین ٹکٹ مانٹی نگرو کے، دو پیرو کے اور چار جزیرۂ چلی کے بھیجے، اس سے مطلب یہ تھا کہ فلاں بندرگاہ پر تین بڑے جنگی جہاز دو چھوٹے اور چار ہلکے کروزر موجود ہیں۔

دن کی روشنی میں تحت الاحمر (Infra-red) شعاعوں کے ذریعہ سے میلوں تک خبر پہونچائی جا سکتی ہے۔ ان شعاعوں کو ایک خاص شیشے کے ذریعہ سے محسوس کر کے ان کی اطلاعات کو آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ رات کے وقت چمنی کے اندر اس لمپ کو رکھکر ہوائی جہازوں کو بھی اطلاعات بہم پہونچائی جا سکتی ہیں۔

حال ہی میں جب جمعیت اقوام کے اجلاس جنیوا میں ہو رہے تھے اور جنگ چین و جاپان کے سلسلہ میں منچوریا کا قصہ در پیش تھا، تو جاپانی جاسوس ہوٹلوں کے ملازموں کو بڑا بڑا انعام دیکر ٹوکریوں کی ردی حاصل کرتے تھے اور اس طرح بہت سی خفیہ قراردادیں انھیں معلوم ہو جاتی تھیں۔

ایک عورت کسی سفیر کے یہاں ملازم تھی اور اس کا کام کھڑکیوں کے شیشے وغیرہ صاف کرنا تھا، جس وقت وہ باہر جاتی تھی تو اسکے کپڑے وغیرہ اچھی طرح دیکھ لئے جاتے تھے، لیکن باوجود اس تمام احتیاط کے وہ سفیر کے یہاں کی بہت سی خبریں باہر پہونچا دیتی تھی۔ طریقہ یہ تھا کہ جب کھڑکی کو رومال سے صاف کرتی تھی تو دور کسی بلند جگہ پر ایک آدمی کھڑا ہو کر دیکھا کرتا تھا اور یہ ہاتھوں کی مختلف جنبشوں سے اطلاعات بہم پہونچایا کرتی تھی۔

گزشتہ جنگ عظیم کے دوران میں جرمن جاسوس اپنے ساتھیوں کو جو فرانس میں موجود تھے، سایل موسیقی کے ذریعہ سے اطلاعات

بہم پہونچاتے تھے۔ ان رسالوں میں صرف موسیقی کے نشانات ہوتے تھے، لیکن ان سے مدعا کچھ اور تھا۔ اس کا پتہ اس طرح چلا کہ ان میں سے ایک شخص کی ڈاک کی جانچ کی گئی اور جب یہ معلوم ہوا کہ اس کے پاس ہر ہفتہ جرمنی سے موسیقی کا ایک رسالہ آتا ہے تو شبہ پیدا ہوا اور آخر کار پتہ چلا کہ ہفتہ وار جو رسالہ بھیجا جاتا ہے اُس کا ٹائٹل تو ایک ہی ہوتا ہے، لیکن گیت ہمیشہ بدلا ہوا ہوتا ہے۔

ایک بار کوئی جاسوس گرفتار کیا گیا جو ایک نقاش کی حیثیت سے مختلف قسم کی تیتریاں پکڑ پکڑ کر انکی تصویریں بنایا کرتا تھا۔ یہ تیتریاں پکڑنے کے بہانے سے اونچے اونچے پہاڑوں پر پہونچ جاتا اور وہاں سے قلعوں کی اندرونی حالت اور ان کی جنگی طیاریوں کی اطلاع تیتریوں کے نقش و نگار کے ذریعہ سے اپنے ملک کو پہونچاتا تھا۔

جرمن جاسوسوں نے یہ ترکیب بھی کی تھی کہ بعض پیغامات مچھلیوں کے گلپھڑوں میں رکھدیتے تھے اور انھیں دریا کے بہاؤ پر چھوڑدیتے تھے دوسری بندرگاہ پر ان مچھلیوں کو پکڑ کے ان اطلاعات کو حاصل کر لیا جاتا تھا۔

چمنیوں کے دھوئیں کے ذریعہ سے بھی خفیہ اطلاعات پہونچائی جاتی ہیں۔ دھوئیں کی کمی زیادتی اور مختلف وقفوں سے ان کا نکلنا، خاص خاص اشاروں کو ظاہر کرتا ہے۔

نظر نہ آنے والی سیاہیوں میں (Aspirin) کا محلول خاص چیز ہے۔ اس سے جو عبارت لکھدی جاتی ہے وہ یوں تو نظر نہیں آتی لیکن فوق البنفسجی شعاعیں ڈالنے سے فوراً نمودار ہوجاتی ہے۔

مکتوبات نیاز

کی کتابت و طباعت کا کام جنوری کے رسالہ کی وجہ سے بند ہوگیا تھا لیکن اب پھر شروع کر دیا گیا ہے اور اپریل تک اس کی اشاعت کی توقع کی جاتی ہے۔

جن حضرات کی پیشگی رقم وصول ہوگئی ہے وہ مطمئن رہیں کہ کتاب شایع ہوتے ہی ان کے نام روانہ کردی جائے گی۔

بعض حضرات نے بغیر رقم بھیجے ہوئے صرف نام درج کرایا ہے، لیکن ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ محض نام درج کرالینا رعایتی قیمت سے فائدہ اُٹھانے کا مستحق قرار نہیں دیتا۔ ضرورت ہے کہ دو روپیہ پیشگی رقم بھیجدی جائے۔ ورنہ اشاعت کے بعد ان کو تقریباً اس سے دوچند ادا کرنا پڑے گا۔

غالباً اس کے اظہار کرنے کی ضرورت نہیں کہ ادب اُردو میں یہ مجموعہ کیا چیز ہوگا اور اس سے محروم رہنا، اُردو کے اُس صنف انشار سے محروم رہنا ہوگا جس کی نظیر اس وقت تک پیش نہیں کی جاسکتی۔

منیجر نگار

ذوق کا مذہب

تھوڑے دن ہوئے، مجھے ایک خاص وجہ سے ذوق کے مذہب کے متعلق تجسس کی ضرورت پیش آئی۔ میں نے سب سے پہلے آبِ حیات سے استفادہ کیا۔ کیونکہ آزاد مرحوم سے زیادہ شیخ کا کوئی ارادتمند نہ تھا۔ اور آبِ حیات میں جس شرح و بسط سے انھوں نے اپنے اُستاد کے حالات تحریر فرمائے ہیں۔ اس سے بعض حلقوں میں تو یہ خیال پیدا ہو گیا ہے۔ کہ اس کتاب کی تصنیف کی علتِ غائی صرف شیخ کی ذات اور شاعری کو اُجاگر کرنا ہے۔ مگر جب میں نے آبِ حیات کی ورق گردانی کی۔ تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب وہاں یہ سطور دیکھیں:۔

"فقرا اور بزرگانِ دین کے ساتھ انھیں ایسا اعتقاد تھا کہ اس کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی۔ علما اور اساتذۂ سلف کو ہمیشہ باادب یاد کرتے تھے۔ اور کبھی ان پر طعن و تشنیع نہیں کرتے تھے۔ اس واسطے ان کے مذہب کا حال کسی کو نہ کھلا۔" (صفحہ ۴۶۶)

مانا کہ ان کی صلح کل طبیعت کی وجہ سے "ان کے مذہب کا حال کسی کو نہ کھلا" مگر کیا یہ حال حضرت آزاد پر بھی نہ کھلا۔ کہ ان کا کیا مذہب ہے ان کا فرض تھا کہ اس باب میں اپنے علم کے مطابق لوگوں تک صحیح واقفیت پہونچا دیتے اور تذکرہ نگاری کا حق ادا فرماتے۔ بعینہٖ یہی الفاظ انھوں نے اپنے مرتبہ دیوان ذوق کے دیباچہ میں بھی لکھے ہیں۔ (صفحہ ۲۶)

اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ میں خود دیوان ذوق کو دیکھ کر فیصلہ کرتا۔ اگرچہ یہ طریقہ نہایت غیر یقینی اور شبہات سے پُر ہے۔ مگر چونکہ اس کے علاوہ کوئی اور ماخذ نہ تھا (یا کم از کم مجھے اس کا علم نہیں) اس لئے مجبوری تھی۔ دیوان کھولتے ہی پہلی غزل میں یہ اشعار نظر آئے:۔

ہوا حمدِ خدا میں دل جو مصروفِ رقم میرا　　الف الحمد کا سا بن گیا گویا قلم میرا
رہے نام محمد لب پہ یارب اول و آخر　　اُلٹ جائے بوقتِ نزع جب سینہ میں دم میرا
محبت اہلِ بیتِ مصطفیٰ کی نور برحق ہے　　کہ روشن ہو گیا دل مثلِ قندیلِ حرم میرا
دکھائی مجھ کو راہِ شرع اصحابِ پیمبر نے　　چراغِ راہ ہے اکرام اصحاب کرم میرا
کہیں شاہِ نجف کے عشق میں دل میرا ڈوبا تھا　　کہ ہے دُرِّ نجف ہو کر چمکتا دُرِّ یم میرا
رہیگا دانہ افشاں مزرعِ امیدِ بخشش میں　　غمِ آلِ نبی سے دانۂ ہر اشکِ نم میرا
شہِ بغداد کا خطِ غلامی ذوق رکھتا ہوں　　نہ کیوں دل اس خطِ بغداد سے ہو جامِ جم میرا

اس ایک غزل میں جنابِ شیخ نے حمد و نعت کے دو شعروں کے علاوہ اہلِ بیت اور حضرت علی اور صحابہ کرام کی شان میں چار اشعار کہے ہیں۔ مقطع میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کا ذکر ہے اس سے مولانا آزاد کے مندرجہ صدر کلام کی تصدیق ہوتی ہے۔ کہ ان کو بزرگانِ دین سے اعتقاد اور وہ علماء سلف کا بہت ادب کرتے تھے۔

اہلِ بیت اور خصوصاً شہید کربلا کے متعلق انھوں نے بعض اور جگہ بھی لکھا ہے۔ اور ان کی محبت کو ذریعہ سعادت قرار دیا ہے فرماتے ہیں:۔

حُبِ حسین ذوقؔ وہ شے ہے کہ جس سے حُر　　تھا گرچہ اشقیا میں سعیدوں میں مل گیا

ایک رُباعی میں حضرت امام حسن اور امام حسین دونوں کا ذکر دیکھئے کس والہانہ انداز سے کرتے ہیں۔

سبطینِ نبی یعنی حسن اور حسین　　زہرا اور علی کے دونوں وہ نور العین
عینک ہے تماشائے دو عالم کے لئے　　اے ذوقؔ لگا آنکھوں سے ان کے نعلین

ایک قصیدہ کو جو جناب سید عاشق نہال صاحب کی مدح میں تحریر فرمایا ہے، اپنے متعلق اس دعا پر ختم کیا ہے۔

نکلے بہ صبحِ حشر تو رنگ اس کا جوں شفق
ہو سرخ دوستی سے محمد کی آل کے

ان سب اشعار سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انھیں حضرت علی اور ان کے اولوالعزم صاحبزادوں سے خاص وابستگی تھی اور ان کا رجحان بلاشبہ "تفضیلیت" کی طرف تھا۔ مگر جیسا کہ ان کے سرنامہ کی غزل سے عیاں ہے۔ انھیں غالی شیعوں کے مانند دوسرے صحابہ کبار سے کوئی عناد نہ تھا بلکہ وہ انھیں بھی عزت کی نگاہ سے دیکھتے اور حامیانِ اسلام سمجھتے تھے۔ ان کا مذہب وہی تھا جو عام اہلِ سنت کا مذہب ہے کہ وہ سب صحابہ رسول کو ذکرِ خیر سے یاد کرتے ہیں۔ مگر اس میں صرف اتنا اضافہ تھا کہ وہ تفضیلی تھے انھیں حضرت علی سے خاص محبت نظر آتی ہے۔ بعینہ اسی طرح جیسے پچھلے دنوں حضور نظام دکن نے اپنے ایک اعلان میں اپنے مذہب کے متعلق بعض غلط فہمیوں کا ازالہ کرتے ہوئے فرمایا کہ میں حنفی سنی ہوں البتہ تفضیلیت سے ممتاز ہوں۔ حضرت ذوقؔ بھی ایک رباعی میں حضرت علی کے متعلق لکھتے ہیں:۔

اعلیٰ ہے علی کی امامت کا مقام　　رکھتے ہیں خبر اس سے یہاں خاص نہ عام
جو لوگ صفِ اول میثاق میں تھے　　پوچھے کوئی ان سے کہ وہ کیسا تھا امام

اس کے باوجود وہ پہلے تینوں خلفاء اسلام کے حامیِ شریعت اور عابد و مرتاض ہونے کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

رہے تا کام دینداروں کو احکام شریعت سے　　خوشی تا حاجیوں کو ہووے کعبہ کی زیارت سے
رہے تا عابدوں کو شوق محراب عبادت سے　　نمازِ اہلِ سنت تا ہو مسجد میں جماعت سے

ترا خطبہ میں ہو نام اور خطبہ زیر منبر ہو
ترا حامی ابوبکر و عمر عثمان و حیدر ہو

اس سے ظاہر ہے کہ شیخ مرحوم کا عقیدہ دوسرے سُنی حضرات سے الگ نہیں، انھیں خلفائے اربعہ میں سے ہر ایک سے محبت تھی وہ سب کو ایک آنکھ سے دیکھتے اور ان کی خدماتِ دینیہ کی تعریف کرتے تھے۔ ہاں جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ انھیں حضرت علی سے ان کے زہرا بتول کے شوہر اور حسنین کے والد بزرگوار ہونے کی وجہ سے خاص محبت تھی۔ مگر اس میں اتنا غلو نہ تھا کہ وہ دوسرے صحابہ کو غاصب قرار دینے لگیں اور ان پر تبرہ بازی شروع کر دیں۔ وہ حُبِ علی کو نور سے موسوم کرتے ہیں۔ مگر تبرہ کو اس نور میں ظلمت کی آمیزش سے کم نہیں سمجھتے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

تم بیٹھے بغل میں ہو رقیب دغلی کی	کی گرم بغل ہم نے بھی گورِ بغلی کی

اے ذوق نہ کر نور میں آمیزشِ ظلمت	کیا کام تبرہ کو محبت میں علی کی

الغرض میں نے دیوان ذوق کے مطالعہ سے یہ نتیجہ نکالا کہ حضرت ذوق شیعہ نہ تھے۔ جن لوگوں کو یہ شک گزرا ہے کہ ذوق شیعہ تھے۔ مگر بہادر شاہ کے سنی ہونے کے سبب سے وہ کھل کر اپنی شیعیت کا اظہار نہیں کر سکتے تھے اس لئے انھوں نے تقیہ کیا۔ میرے خیال میں ان صحاب کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس کی تائید میں ایک اور امر بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔

آزاد کے والد مولوی محمد باقر کے تعلقات شیخ مرحوم سے نہایت گہرے تھے اور آزاد ان کے ایسے شاگرد رشید پیدا ہوئے، کہ اگر وہ نہ ہوتے تو غالباً آج کوئی دیوان ذوق کا نام نہ جانتا۔ یہ ناممکن ہے۔ کہ اس خاندان سے ان کے معتقدات پوشیدہ رہے ہوں۔ اس لئے اگر اس پر بھی حضرت آزاد نے اپنے اُستاد کے حالات میں اس موضوع کو تشنہ چھوڑ دیا۔ تو اس کا کوئی خاص سبب ہونا چاہئے۔ دیوان ذوق کی ترتیب یا آب حیات کی تالیف کے وقت انھیں بہادر شاہ کی سیاست کا خوف نہ تھا کہ وہ تقیہ پر مجبور ہوتے۔ بس اس کا ایک ہی سبب ہو سکتا ہے کہ ان کے اُستاد کا عقیدہ ان کے عقیدہ سے مختلف تھا۔ جس کا اظہار انھیں ناپسند تھا۔ خاندانِ آزاد کی شیعیت سے کسی کو انکار نہیں۔ اگر ذوق بھی شیعہ ہوتے تو آزاد کے لئے مقامِ فخر تھا کہ انھیں بھی اپنا ہم نوا ظاہر کرتے۔ بہر حال اس باب میں ان کی خاموشی اور ابہام معنی خیز ضرور ہے۔

کیا آپ اس مسئلہ پر کچھ مزید روشنی ڈال سکتے ہیں۔ ممکن ہے کسی معاصر کے قول یا کسی اور ماخذ سے آپ اور واقفیت مہیا کر سکیں۔ والسلام

مالک رام (ایم۔اے۔ ایل ایل بی)

(**نگار**) آپ نے جس انداز سے اس مسئلہ پر گفتگو کی ہے اس سے یہ بات تو یقینی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ ذوق کے عقائد مایل بہ تفضیلیت تھے، اور خلفاء ثلثہ کے سب و شتم کو پسند نہ کرتے تھے لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ وہ "حنفی" تھے اُصولاً درست نہیں۔

میں اس موقعہ پر مذہبی نقطۂ نظر سے کوئی بحث کرنا ضروری نہیں سمجھتا کہ حضرت علی کو افضل سمجھنے کا کیا مفہوم ہے اور محض عقیدۂ "افضلیت" ہی تشیع کے لئے کافی ہے یا نہیں، لیکن اس امر کے اظہار سے باز نہیں رہ سکتا کہ وہ شخص جو جناب امیر کی افضلیت کا قایل ہے لیکن خلفاء ثلثہ کے سب و شتم کو اچھا نہیں سمجھتا، اس کو بجائے حنفی تفضیلیہ کے

"شیعہ غیر تبرائی" کہنا زیادہ موزوں ہے۔

آپ کو دیوان کھولتے ہی جو غزل ذوق کی نظر پڑی ہے، اس میں یقیناً صحابہ کا ذکر ہے، لیکن "خلفاء ثلثہ" کا تو نہیں صحابہ کی جماعت میں خلفاء کے علاوہ اور بھی تو بہت سے حضرات شامل تھے ــــ رہ گیا "شہ بغداد" کا ذکر، سو ممکن ہے کہ وہ صرف بادشاہ کے خوش کرنے کے لئے ہو۔

رہا یہ امر کہ اگر ذوق شیعہ ہوتے تو آزاد ضرور اس کا اظہار کرتے، سو اس کی توجیہہ یہ ہو سکتی ہے کہ چونکہ ذوق، آزاد کی طرح کے غالی شیعہ نہ تھے اس لئے انھوں نے گوارا نہیں کیا کہ ایسے ضعیف الاعتقاد شیعہ کو "شیعہ" کہا جائے۔

بہرحال یہ وہ ایرادات ہیں جو آپ کے نتیجۂ تحقیقات پر وارد ہو سکتے ہیں۔ لیکن خود میرا ذاتی خیال یہی ہے کہ وہ شیعہ نہ تھے اور ان کی "تفضیلیت" محض تقلیدی یا روایتی بات تھی جو صوفیہ کے اثر سے ہندوستان کے اہل تسنن میں رائج ہوئی اور جس کا تعلق "اہل تشیع" کے عقیدۂ افضلیت علی سے کوئی نہیں ہے۔

شہوانیات یا ترغیبات جنسی

حضرت نیاز کے قلم سے

جس میں فحاشی کی تمام فطری و غیر فطری قسموں کے حالات اور ان کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی اور آیندہ اخلاق انسانی کی بنیاد کن اصول پر قایم ہونا ہے الغرض اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ کتاب بالکل نئی چیز ہے اور ایکبار شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کئے ہوئے آپ اسے چھوڑ نہیں سکتے۔ اس کتاب میں ایسے ایسے حیرت انگیز واقعات درج ہیں کہ آپ نے کبھی سُنے نہ ہوں گے اگر آپ نگار کے خریدار ہیں تو علاوہ محصول ۸؍ کے مجلد کتاب صرف ۸؍ عہ میں اور غیر مجلد عہ میں ملیگی اور اگر آپ نگار کے خریدار نہیں ہیں تو مجلد ۸؍ عہ میں اور غیر مجلد عہ میں علاوہ محصول ۸؍ کے ملے گی۔

اگر

ارشاد ہو تو کتاب بذریعہ وی۔ پی روانہ کی جائے حجم ۳۷۵ صفحات آرڈر میں مجلد و غیر مجلد کی صراحت ضروری ہے۔

منیجر نگار لکھنؤ

باب الاستفسار

مہدوی جماعت اور امام مہدی

(جناب محمد ابراہیم صاحب - اعظم جاہی روڈ - حیدر آباد دکن)

یہاں حیدر آباد میں ایک جماعت مہدویّن کے نام سے پائی جاتی ہے۔ براہِ کرم مطلع فرمایئے کہ ان کی کیا اصلیت ہے اور کہاں کہاں پائی جاتی ہے۔ اسی کے ساتھ اس مسئلہ پر بھی روشنی ڈالئے کہ امام مہدی کا ظہور کیا حقیقت رکھتا ہے؟

(نگار) (۱) جونپور میں ایک صاحب سید محمد مہدی وسطویں صدی کے آخر میں پائے جاتے تھے اور یہ اپنے آپ کو "مہدی موعود" کہتے تھے ان کی یہ تبلیغ چونکہ گجرات میں شروع ہوئی تھی اس لئے احمد آباد و دیگر بلاد گجرات میں ان کے ارادتمند معقول تعداد میں پیدا ہو گئے۔ ان کے متبعین کا عقیدہ ہے کہ وہ حامل معجزات بھی تھے، یہاں تک کہ مُردوں کو زندہ کر سکتے تھے اور گونگے بہرے کو اچھا کر دیتے تھے۔

کچھ عرصہ تک تو یہ جماعت بغیر کسی روک ٹوک کے اپنے عقاید کا اعلان کرتی رہی، لیکن شاہ مظفر اول، والی گجرات نے سخت گرفت شروع کی اور ان میں سے بعض کو پکڑ کر قتل بھی کر دیا۔ اس کے بعد اورنگ زیب نے بھی جب وہ احمد آباد کا گورنر تھا ان کو سزائیں دیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں نے تقیہ شروع کر دیا اور اب تک یہ لوگ اس کے عادی ہیں۔

اسی جماعت کے افراد بمبئی، دکن، سندھ، گجرات اور کہیں کہیں شمالی ہند میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ سید محمد مہدی، مہدی موعود اور آخری امام تھے۔ شادی و موت کے وقت ان کے یہاں خاص مراسم ادا کئے جاتے ہیں جو عام مسلمانوں سے علیٰحدہ ہیں۔

(۲) لفظ مہدی جس کے معنے "ہدایت یافتہ" کے ہیں، کلام مجید میں تو کہیں نہیں پایا جاتا، لیکن یوں احادیث و تاریخ میں کثرت سے نظر آتا ہے۔ لغوی معنی میں اس کا استعمال تو اکثر لوگوں پر ہوا ہے، چنانچہ خلفاء اربعہ کو بھی "الراشدون المہدیون" کے لقب سے یاد کیا گیا ہے اور اہلِ تسنن نے حضرت علی کا ذکر بھی "ہادیاً و مہدیاً" کے الفاظ سے کیا ہے۔ اسی طرح جریر نے حسّان بن ثابت کو مہدی کے لقب سے پکارا اور امام حسین کو سلیمان "مہدی ابن مہدی" کہتا تھا۔ یہاں تک کہ خلفاء بنی امیہ کے نام کے ساتھ بھی اُن کے ہوا خواہوں نے مہدی کا لفظ

اضافہ کیا۔ الغرض لغوی معنی میں اظہار عزت و احترام کے لئے یہ لفظ بہت سے امراء و خلفاء کے لئے استعمال کیا گیا، لیکن مہدی موعود کو یا مہدی منتظر کو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔

یہ حیثیت سب سے پہلے جناب حسین کے قتل کے بعد محمد الحنفیہ کو دی گئی جو جناب امیر کے صاحبزادہ (دوسری بیوی سے) تھے ۔۔۔ ان کو مختار ابی ابن عبید نے دعویدار خلافت کی حیثیت سے پیش کر کے "مہدی ابن الوصی" کے لقب سے مشہور کیا۔ ہر چند انھوں نے خود اپنے آپ کو اسکا اہل نہیں سمجھا، لیکن اس طرح ایک فرقہ کیسانیہ کی بنیاد ضرور پڑ گئی اور یہیں سے سلسلۂ امامت میں شیعی جماعت کے دو گروہ ہو گئے، ایک وہ جس نے محمد الحنفیہ کی امامت کو تسلیم کر کے انھیں مہدی منتظر سمجھا اور دوسرا اثنا عشری گروہ جو محمد الحنفیہ کی امامت کو اس لئے تسلیم نہیں کرتا کہ خاندان نبوت سے ان کو کوئی واسطہ نہ تھا۔ مہدی کا عقیدہ ان کے یہاں بھی ہے لیکن اس طرح کہ وہ چھپے ہوئے ہیں اور ابھی تک ظاہر نہیں ہوئے۔

چونکہ اُس وقت دعویداران خلافت کی کمی نہ تھی اور نیم سیاسی و نیم مذہبی جماعتیں ابھر رہی تھیں اس لئے اپنی حقانیت کے ثابت کرنے کے لئے ان میں سے ہر ایک کوئی نہ کوئی بات ایسی پیش کرتی تھی جس کا تعلق فرمان رسول سے ہو اور اسی سلسلہ کی چیز ظہور مہدی کا بھی مسئلہ تھا۔

اہل تسنن کے یہاں ظہور مہدی کا عقیدہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا اور بخاری و مسلم میں کسی جگہ مہدی کا ذکر نہیں ہے۔ عقاید کی کتابوں میں بھی کسی جگہ اس سے بحث نہیں کی گئی، البتہ دجال کا ظہور اور نزول عیسیٰ کا بیان ضرور پایا جاتا ہے جس کا مہدی موعود سے کوئی تعلق نہیں۔

ابن خلدون نے تاریخ کے مقدمہ میں اس مسئلہ میں نہایت محققانہ گفتگو کی ہے اور اس نے ثابت کیا ہے کہ ابتدائی حدیث کی کتابوں میں اس قسم کی کوئی روایت نہیں پائی جاتی اور یہ خیال بعد کو پیدا ہو کر وضع احادیث کا سبب بنا۔ ابن خلدون نے ۲۴ احادیث اس موضوع کی جمع کر کے ان پر تنقید کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں ہے جس پر اعتماد کیا جائے۔

بعض روایات کی تفسیر سے جو حالات مہدی موعود کے معلوم ہوتے ہیں یہ ہیں کہ وہ آل فاطمہ سے ہوں گے، ان کا نام وہی ہوگا جو رسول کا ہے، اور ان کے باپ کا نام بھی وہی ہوگا جو رسول اللہ کے والد کا تھا، خُلق میں رسول اللہ کے مشابہ ہوں گے، چند یا کے بال صاف ہوں گے، ناک اونچی اور آگے کو جھکی ہوئی ہوگی۔ جس وقت وہ ظاہر ہوں گے، دُنیا میں فتنہ و فساد پھیلا ہوگا یہانتک کہ اگر کوئی اللہ کا نام بھی زبان سے نکالے گا تو مار ڈالا جائے گا۔ یہ آکر فتنہ و فساد کو رفع کریں گے اللہ کا نام بلند کریں گے، عدل و انصاف کو رواج دیں گے اور مسلمانوں پر ایسا زمانہ خوشحالی کا آئے گا کہ اس سے قبل کبھی نہ آیا تھا، اگر کوئی شخص اُن سے کہیگا کہ "اے مہدی مجھے کچھ دو"، تو وہ اسکے دامن میں زر و دولت بکھیر دیں گے۔

یہ حالات احادیث میں نہیں ہیں بلکہ مفسرین احادیث نے اپنی طرف سے بڑھائے ہیں۔ الغرض اہل تسنن کے یہاں مہدی موعود کے ظہور کو تسلیم نہیں کیا جاتا البتہ اثنا عشری طبقہ اس کا قایل ہے اور اُن کی آمد کا منتظر۔

بات یہ ہے کہ پیشین گوئیوں کی جتنی احادیث ہیں وہ کسی طرح چنداں قابل لحاظ نہیں، کیونکہ "علم غیب" کے جاننے سے خود رسول اللہ نے صراحتہً انکار کیا ہے اور اس نوع کی روایات صرف پروپاگنڈا کے لئے وضع کرلی گئی ہیں۔

برتھ کنٹرول یا ضبطِ تناسُل

(جناب عبدالحی صاحب۔ کٹرہ۔ الہ آباد)

اس وقت برتھ کنٹرول کے متعلق دنیا میں زیادہ زور دیا جا رہا ہے کیا ہندوستان کے لئے اس پر عمل کرنا مناسب ہے اور شرعاً اس کو جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس تحریک کا اصل مقصد کیا ہے؟

(نگار) جس حد تک جذبات یا عواطف کا تعلق ہے، انسان وحیوان دونوں میں زیادہ فرق نہیں، لیکن جو چیز انسان کو عام حیوانات سے جدا کرتی ہے وہ اس کی عقل وفراست ہے، یعنی ایک حیوان اس چیز سے معرّا ہے اور انسان کی تمام ترقیاں اسی سے وابستہ ہیں۔ پھر چونکہ یہ دور عقل وفراست کا دور ہے اس لئے جذبات وعواطف کے مقابلہ میں زیادہ تر اسی کے احکام پر عمل کیا جاتا ہے، اور مسئلۂ "ضبط تناسل" بھی منجملہ اُن چند مسائل کے ہے جن میں جذبات پر عقل ومصلحت کو ترجیح دیجاتی ہے۔

اب مختصراً موافق ومخالف دونوں جماعتوں کے دلایل بھی سُن لیجئے:۔

ضبط تناسل کے محرکین کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ جس طرح انسان تمام خواہشات میں عقل کا پابند ہے، اسی طرح خواہش تناسل میں بھی اس کو مصالح معاشرت و تمدن کا پابند ہونا چاہئے۔ غذا کی خواہش انسان کی فطری خواہش ہے، لیکن وہ ہمیشہ اس امر کی احتیاط رکھتا ہے کہ نامناسب یا زیادہ غذا سے اس کی صحت کو نقصان نہ پہونچے، اسی طرح تناسُل کے باب میں بھی مصلحت خاندانی، صحت ذاتی، منشاءِ اقتصاد اور تربیت صحیحہ کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ اس وقت دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو ضعیف العقل ہیں، مجہول الاعضا ہیں، اور نہایت خراب صحت رکھتے ہیں، اس لئے اگر ان کو افزایش نسل کے لئے آزاد چھوڑ دیا گیا تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ نوع انسانی میں بیکار ولایعنی افراد کا اضافہ کیا جاتا ہے اور اس سے دنیا کی اقتصادی حالت اور ملکی وملی ترقی کو جتنا نقصان پہونچ سکتا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ کرۂ زمین محدود مساحت رکھتا ہے اور انسان کا سلسلۂ تناسل غیر محدود ہے، اس لئے اگر ضبط تناسُل سے کام نہ لیا گیا تو ایک وقت آئیگا، جب کثرت آبادی سے (اور آبادی بھی وہ جس میں زیادہ حصہ ناکارہ افراد کا ہے) زمین پر آزادی سے سانس لینے کی جگہ باقی نہ رہیگی اور لامحالہ حرب واستعمار کے مصائب اور بڑھیں گے۔

چوتھی دلیل یہ ہے کہ کثرت تناسُل کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مزدور جماعت کے افراد بڑھیں گے، اس لئے لازماً اُن میں تصادم وتزاحم پیدا ہوگا اُجرت میں کمی ہوگی اور معیشت ومعاشرت خراب ہو کر تمدن کو سخت نقصان پہونچے گا، برخلاف اس کے اگر ان کی تعداد کم ہو گی تو

اُجرتیں بڑھیں گی اور ان کی معاشرت بلند ہو کر نظام تمدن پر اچھا اثر پڑے گا۔

مخالفین کی دلیل یہ ہے کہ ضبط تناسل ارادۂ خداوندی اور منشاء فطرت کے خلاف ہے اور اس حجت کو زیادہ تر اہل مذاہب پیش کرتے ہیں، کیونکہ انھیں کو افزائش نسل کا زیادہ شوق ہے اور اپنے جذبۂ شہوانی کو ضبط کرنے میں وہی سب سے زیادہ کمزور واقع ہوئے ہیں چنانچہ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ جہاں کیتھولک عیسائیوں کی جماعت زیادہ ہے، وہاں بہ نسبت پروٹسٹنٹ عیسائیوں کے نسل زیادہ بڑھ رہی ہے۔

مادی علماء کا اعتراض اسباب عمرانی کی بناء پر یہ ہے کہ جن طبقوں میں اولاد کی کمی کی شکایت ہے وہ اونچے اور متوسط طبقے ہیں اور انھیں طبقوں پر ملک او قوم کی علمی و دماغی ترقیاں منحصر ہیں۔ لیکن حالت یہ ہے کہ ان طبقوں میں افراد کی کمی کو ہمیشہ طبقۂ عمال پورا کیا کرتا ہے یعنی رفتہ رفتہ نیچے طبقہ کے لوگ متوسط و اعلیٰ طبقہ تک پہونچ جاتے ہیں، اس لئے اگر اس جماعت میں ضبط تناسل کا رواج ہو گیا تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ متوسط اور اعلیٰ طبقے دونوں آہستہ آہستہ کم ہو جائیں گے اور تمدنی و علمی ترقیوں کو سخت نقصان پہونچے گا۔

فرانس میں ایک زمانہ تک ضبط تناسل کی اتنی احتیاط کی گئی کہ عرصہ تک اُن کی آبادی بجائے بڑھنے کے برابر گھٹتی رہی، برخلاف اسکے جرمنی نے افزائش نسل کی کوششیں برابر جاری رکھیں، نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس نے اس خطرہ کو محسوس کیا اور آخر کار اس کو بھی ادھر توجہ ہوئی اور اُن خاندانوں کے وظائف مقرر کئے جن میں اولاد زیادہ ہوتی ہے۔

ایک امریکن خاتون مسز سانگر نے ضبط تناسل کی ایک کانفرنس میں اہل امریکہ کو مخاطب کر کے کہا کہ:۔

"اگر امریکہ دوسری قوموں کے لئے اپنے ملک کے دروازے اس لئے بند کرتا ہے کہ اُن کے امتزاج سے یہاں کی نسل خراب ہو جائے گی تو اسے یہ بھی توجہ کرنی چاہئے کہ خود ملک کے اندر ناقابل افراد کی زیادتی نہ ہو درانحالیکہ اس کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا اور امریکہ میں بیماروں، مجرموں اور ناقص العقل لوگوں کی آبادی بڑھتی جا رہی ہے۔"

اسی جلسہ میں انگریزوں کے ایک نمائندہ مسٹر بلانڈ نے کہا کہ:۔

"مدنیت کا مستقبل دنیا کے مسئلۂ آبادی حل کرنے پر موقوف ہے، یعنی یہ کہ ہم کو دنیا کی لغو و ناکارہ آبادی زہریلی گیس کے ذریعہ سے کم کرنا پڑے گی یا ضبط تناسل سے۔ اگر آج کرۂ عطارد کا بسنے والا کوئی فرد کرۂ ارض پر آ جائے تو وہ ہماری موجودہ حضارت کو دیکھ کر حیران رہ جائے کہ یہ کیسی قوم ہے جو ایک طرف نسل بھی بڑھاتی جاتی ہے اور دوسری طرف اُن کے ہلاک کرنے کی بھی فکر میں ہے۔"

اسوقت دنیا میں تقریباً ایک ارب ۵۰ لاکھ نفوس پائے جاتے ہیں اور موجودہ پیداوار غذا کسی نہ کسی طرح ان کے لئے کافی ہو جاتی ہے لیکن اگر ازدیاد نسل کا یہی عالم رہا تو ایک صدی میں موجودہ آبادی دوچند سے زیادہ بڑھ جائے گی (کیونکہ ہر سال پندرہ ملین آبادی بڑھ رہی ہے) اور ضرورت ہوگی کہ کم از کم ۱۰۰ ملین ایکڑ زمین اور قابل زراعت پیدا کی جائے، درانحالیکہ اس کا کسی طرح امکان نہیں، اس لئے لامحالہ اسکا نتیجہ یہ ہو گا کہ قلت غذا، کثرت امراض اور تصادم باہمی کی وجہ سے مصائب دنیا زیادہ بڑھ جائیں گے۔ مسٹر ہارلڈ کاکس نے دوران تقریر میں ظاہر کیا کہ:۔

"اس تلخ حقیقت کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ سطح زمین بہت محدود ہے اور انسان کی قوت تناسل غیر محدود

اس لئے اگر نسل کشی کو کم نہ کیا گیا تو ایک دن وہ آئے گا جب انسان ایک ایک انچ جگہ کے لئے باہم کشت و خون پر مجبور ہو گا اور نظام تمدن درہم برہم ہو جائے گا"

بہرحال اس وقت متمدن دنیا کا میلان زیادہ تر اسی طرف ہے کہ نسل انسانی کو بڑھنے سے روکا جائے اور صرف ایسے افراد کا اضافہ کیا جائے جو صحت جسم و عقل کے لحاظ سے دنیاوی ترقی میں معاون ثابت ہوں۔

ہندوستان میں بھی یہ تحریک روز افزوں ترقی کر رہی ہے اور ہر چند اس وقت تک کوئی عملی قدم تو اس طرف نہیں اٹھایا گیا لیکن اس خیال کا پیدا ہو جانا ہی دلیل ہے اس امر کی کہ کسی نہ کسی وقت اس پر عمل ہو کر رہیگا۔ رہا اس امر کا فیصلہ کہ یہاں کے لئے یہ تحریک قابل عمل ہے یا نہیں، چنداں دشوار نہیں۔

یہ امر مسلم ہے کہ دنیا میں جب کبھی کوئی انقلاب پیدا ہوا ہے، اس کا تعلق ہمیشہ ذہن انسانی سے رہا ہے نہ کہ جسم انسانی سے، یا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ کام ہمیشہ "کیفیت و احساس" نے کیا ہے نہ کہ "مقدار و تعداد" نے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ کسی ملک میں ناکارہ افراد کی زیادتی کبھی باعث برکت نہیں ہو سکتی۔ بلکہ بجائے فائدہ کے اس سے مضرت پہونچتی ہے۔

کیا اس حقیقت سے انکار ممکن ہے کہ اگر ہندوستان کی آبادی بجائے ۳۴ کرور کے صرف ۱۰ کرور ہوتی تو یہ ملک اس وقت تک اسی غلامی کی حالت میں پایا جاتا۔ یقیناً اس سے بہت قبل بیداری و قوت عمل پیدا ہو جاتی اور اتنے کثیر افراد کو کسی ایک مرکز پر لانے کی زحمت گوارا نہ کرنا پڑتی۔ پھر اسی کے ساتھ اقتصادی دشواریوں کو دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ ہندوستان کی سب سے بڑی لعنت یہی ہے کہ غریب و جاہل، بیمار و ضعیف بے عقل و معتوہ افراد میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور عسرت و افلاس اس حد تک پہونچ گیا ہے کہ اس کا چارہ بجز اس کے اور کوئی نہیں کہ فطرت پھر ان کو ہلاک کر ڈالے۔ اس لئے اگر افزائش نسل صرف اس لئے چاہی جاتی ہے کہ ہم بار بار ان کی ہلاکت کا تماشہ دیکھتے رہیں تو کیا اس سے زیادہ مناسب یہ نہیں ہے کہ ابتدا ہی سے ہم اس کی احتیاط کریں اور آفرینش و ہلاکت کے اس مسابقت میں بجائے فرشتۂ موت کے ساتھ دینے کے فرشتۂ امن و سکون کی راہ میں آسانیاں بہم پہونچائیں۔

تذکرۂ طوطیانِ ہند

کے نام سے شعر کہنے والی خواتین کا ایک تذکرہ شائع ہو رہا ہے، جس میں شروع سے اس وقت تک کی اردو شعر کہنے والی عورتوں کے حالات اور کلام کے نمونے درج ہوں گے۔

جو اصحاب اس قسم کا مواد دے سکیں براہ کرم جلد روانہ کر دیں کیونکہ تذکرہ پریس میں جا رہا ہے۔

سید تمکین کاظمی۔ عثمان پورہ۔ حیدر آباد دکن

محبت سے پہلے

ابھی اخترؔ نہ تھا میں مبتلائے دردِ محبت میں
مگر پھر بھی تغیر ہو چلا تھا میری حالت میں

پسند آنے لگی تھیں پُرسکوں تنہائیاں مجھ کو
نہ بھاتی تھیں جہاں والوں کی بزم آرائیاں مجھکو

مجھے دنیا کے ہنگاموں سے اک وحشت سی ہوتی تھی
یہاں کے بے مزہ کاموں سے اک وحشت سی ہوتی تھی

مگر آغوشِ فطرت میں عجب آرام ملتا تھا
مناظر کی محبت میں عجب آرام ملتا تھا

پہونچتا تھا میں پو پھٹنے سے پہلے روز دریا پر
نمودِ صبح کے منظر کو دیکھوں تاکہ جی بھر کر

فلک پر چودھویں کا چاند جب ہوتا تھا جلوہ گر
تو یہ جی چاہتا تھا باغ میں پھرتا رہوں شب بھر

بوقتِ شام جب شور و شغب معدوم ہوتا تھا
کوئی سرگوشیاں کرتا ہوا معلوم ہوتا تھا

میں یہ محسوس کرتا تھا کہ ساون کی سیہ راتیں
میرے دل کو سُنانا چاہتی ہیں راز کی باتیں

ہوائے گلستاں جب ناز سے اٹھلا کے چلتی تھی
تو قلب و روح میں اک دھیمی دھیمی آگ جلتی تھی

تڑپتا تھا میں قمری کی نوائے جانستاں سُنکر
کلیجہ تھام لیتا تھا صدائے "پی کہاں" سُنکر

ادائے مست سے جسوقت کوئل کوک اُٹھتی تھی!
تو اُس کے نشتریں نغموں سے دل میں ہوک اُٹھتی تھی

گھٹا گھر گھر کے آتی تھی تو ہر ہر رگ پھڑکتی تھی!
دلِ سرشار کے ارمانوں کی چھاتی دھڑکتی تھی

وہ ارماں کیا تھے، کیسے تھے یہ مجھکو بھی نہ تھا معلوم
نہ اُن کی ماہیت ظاہر، نہ اُن کا منتہا معلوم

تمناؤں کی اصلیت سمجھ ہی میں نہ آتی تھی
ان ارمانوں کی نوعیت سمجھ ہی میں نہ آتی تھی

یہ حالت تھی کہ میں آٹھوں پہر خاموش رہتا تھا
کسی گہری سہانی فکر میں مدہوش رہتا تھا

تصور کی فضاؤں میں رہا کرتا تھا میں ہر وقت
کسی دریا کی لہروں پر بہا کرتا تھا میں ہر وقت

بنائی تھیں تخیل نے کئی رنگین دنیائیں
کہ جن میں دل، دماغ اور روح عیشِ بیکراں پائیں

میں دن رات آہ! اک موہوم مستقبل میں رہتا تھا
اُسی موہوم مستقبل کے قصے دل سے کہتا تھا

چھپی ہوتی تھی غمگینی مرے رنگیں خیالوں میں
بھری ہوتی تھی رنگینی مرے غمگیں خیالوں میں

مزا آتا تھا بے حد عشق پرور کے فسانوں میں
محبت کی حدیثوں میں، مجنوں کی داستانوں میں

غِنائی شاعری سے ہو گئی تھی گہری دلچسپی
ہوئی پہلے، ہُو آیندہ اِتنی گہری دلچسپی

کوئی باجا بجاتا تھا تو دل میں درد ہوتا تھا
رسیلے گیت گاتا تھا تو دل میں درد ہوتا تھا

ستاتی تھی مجھے جس طرح موسیقی، سُناؤں کیا
رلاتی تھی مجھے کس طرح موسیقی، بتاؤں کیا

حواس و ہوش پر وارفتگی سی چھائی رہتی تھی
طبیعت پر شباب افروز مستی چھائی رہتی تھی

نشے میں چور سی رہنے لگی تھیں خوابناک آنکھیں
چمکتی تھیں اُمنگوں کی ضیا سے تابناک آنکھیں

مرے سینے میں تھی آباد حسّیات کی دنیا!
ہمیشہ مضطرب رہتی تھی یہ جذبات کی دنیا،

جوانی کا لہو میری رگوں میں گنگناتا تھا
بہت پُر کیف لیکن ایک مبہم گیت گاتا تھا

مجھے محسوس ہوتا تھا کہ آفت آنے والی ہے
محبت قہر بن کے روح پر چھا جانے والی ہے

اختر انصاری دہلوی

رقص

رقص کیا ہے؟ "دامنِ امکاں پہ نیرنگِ نشاط
نغمۂ حسن و محبت کا مسلسل ارتباط"

رقص کیا ہے؟ جنبشوں میں داستانِ آرزو
نرم و نازک لوچ میں پٹتی ہوئی سی گفتگو

رقص کیا ہے؟ شوق کا تحلیل ہونا لوچ میں
جوشِ احساسات سے موتی پرونا لوچ میں

رقص کیا ہے؟ نرگسِ مخمور کی بیداریاں
حسنِ خوابیدہ کی لذت کوشیاں۔ ہشیاریاں

رقص کیا ہے؟ جلوۂ تقدیس کی بیباکیاں
داستانِ خامشی یا خامشی کی داستاں

رقص کیا ہے؟ پیکرِ حسن و لطافت کی ادا
ہوش کے انداز میں تعلیمِ پیمانِ وفا

رقص کیا ہے؟ ایک نغمہ حسن میں ڈوبا ہوا
انقلابِ سازِ ہستی کروٹیں لیتا ہوا

رقص کیا ہے؟ ایک تمہیدِ تماشائے بہار
محفلِ اسرار میں تشہیرِ لیلائے بہار

عشوہ و ناز و ادا کی شاعرانہ گفتگو
یا نگاہِ نیم وا کی ملہمانہ گفتگو

خواہشوں کی بیقراری ولولوں کا اضطراب
کسوتِ مینا میں گویا لرزشِ موجِ شراب

ساغرِ ہستی میں جیسے ارتعاشِ موجِ نور
یا پیاماتِ الوہیت کا الہامی ظہور

شمیم بیاوری

"ہمت"

زندگی کی راہ سے انساں بھٹک جاتا ہے جب   منزلوں سے دور تر، گھبرا کے تھک جاتا ہے جب
اعتبارِ زندگی مشکل نظر آتا ہے جب   ذرہ ذرہ دشمن و قاتل نظر آتا ہے جب
جب خیالِ راحت و آرام ہوتا ہے گناہ   مانگتا ہے موت کے سائے میں انساں جب پناہ
خستہ کام آتا ہے جب ملاح ساحل کی طرف   شام کو جب لوٹتا ہے اپنی منزل کی طرف
جب ہوائیں ڈالدیتی ہیں اُسے گرداب میں   موت کے ساماں نظر آتے ہیں موجِ آب میں
سب سے پہلے منحرف ہوتا ہے وہ تقدیر سے   کام پھر لیتا ہے اپنی "ہمت و تدبیر" سے
بادبانوں کو سنبھالے — رُخِ ہوا کا دیکھ کر   اور وہ سہمی ہوئی سی اپنی کشتی پر نظر
مست اپنی دُھن میں اور چپو چلانے سے غرض   اپنی اُس چھوٹی سی کشتی کو بچانے سے غرض
رفتہ رفتہ - جاں رُبا موجوں سے ٹکراتا ہوا   یعنی ساحل پر پہونچ جاتا ہے گھبرایا ہوا

"ہمت" ان جذبات کی بیداریوں کا نام ہے   منزلوں کو جن سے حاصل ایک "قربِ تام" ہے
"ہمت" ان بیتابیوں کی سرفرازی کا ہے رنگ   جن سے انسانوں کی "عقلِ تام" ہو جاتی ہے دنگ
"ہمت" ان بیداریوں کے خواب کی تعبیر ہے   "نصرتِ جاوید" جسکی "مستقل تفسیر" ہے
"ہمت" ان بکھرے ہوئے سے حوصلوں کا ہوش ہے   جن سے خود "رعنائی تقدیر" ہم آغوش ہے
"ہمت" ان کیفیتوں کا اجتماعِ خاص ہے   منحصر جن پر جہاں میں قسمتِ غوّاص ہے
"ہمت" اک انساں کے سر پر جگمگاتا تاج ہے   ہمت انسانی تمدن کے لئے معراج ہے
"ہمت" اس اعلانِ آزادی کی اک تمہید ہے   جسکی ہر منزل میں پنہاں انبساطِ عید ہے
"ہمت" و "مردانگی" وابستہ ہیں اُس ذوق سے   جس کا افسانہ پڑھا کرتی ہیں قومیں شوق سے
"ہمت" ان بدمستیوں کا وہ "خیالِ خام" ہے   جن کا دنیا میں "رضا شاہ پہلوی" انجام ہے
"ہمت" اک تقدیرِ برگشتہ کا ہے واحد علاج   ورنہ کرلیں غیر قومیں آکے ہندوستان پہ راج

"ہمت" اس تکمیلِ خواہش کا ذریعہ ہے شمیمؔ
جس کا احساں مانتی ہے آجتک "جنگِ عظیم"

شمیمؔ نعمانی بیاوری

ساگر کے کنارے

مندر میں پجاری لگے ناقوس بجانے
وہ اُن کے بھجن پیارے وہ گیت انکے سہانے

تاریکیٔ شب اوڑھ کے رخصت ہوا عصیاں
تقدیس کے جاری ہوئے ہر سمت ترانے

وہ چھاؤں میں تاروں کی وہ کھیتوں کے کنارے
دہقان بھی بھیروں میں لگا تان اُڑانے

کوئل نے کسی کنج سے کو کو کی صدا دی
مُرغانِ چمن جاگ اُٹھے گانے لگے گانے

انگڑائیاں لیتا ہوا طوفان جوانی
ملتا ہوا آنکھیں اُٹھا فتنوں کو جگانے

کچھ لڑکیاں آنچل کو سمیٹے ہوئے بر میں
گگری لئے سر پر چلیں پانی کے بہانے

انگشتریٔ حسن کے انمول نگینے
سرچشمے محبت کے مسرت کے خزانے

چلتی ہیں اس انداز سے دامن کو سنبھالے
صدقے ہوئی شوخی تو بلائیں لیں ادا نے

پانی میں لگی آگ پریشان ہے مچھلی
کچھ شعلہ بدن اُترے ہیں پانی میں نہانے

گہ شرم سے مُنھ اپنا چھپانا پسِ آنچل
گہ کھیلنا پانی سے وہ جھینپ اپنی مٹانے

تالاب پر افلاک کے گم گشتہ ستارے
آتے ہیں صبح ہوتے ہی ساگر کے کنارے

مخدوم محی الدین بی اے عثمانیہ

جذبات فرخ بنارسی

پھر کوئی تسکین وہ آشفتہ سامانی نہو
تا اگر سرگرمِ پرسش ہائے پنہانی نہو

عشق کو خود ترجمانِ عشق ہونا چاہئے
ورنہ وہ آئینہ ہی کیا جس میں حیرانی نہو

لوں ہر اک موجِ حوادث سے نیا درسِ حیات
زندگی گر وقفِ آلامِ گراں جانی نہو

ویسے ہی صرفِ تحیر ہے نگاہ امتیاز
یوں نقاب اُلٹو کہ جلووں میں فراوانی نہو

ایک عالم ہے خریدارِ متاعِ نازِ دوست
اتنی بھی جنسِ گرانمایہ کی ارزانی نہو

اے مصیبت دینے والے یوں مصیبت دے مجھے
جان پر چاہے بنے لیکن پریشانی نہو

کیوں جنوں میں کوئی رسوا ہو گریباں پھاڑ کر
شغل بیکاری روادار پشیمانی نہو

مدوجزرِ درد سے ٹھیری ہوئی ہے جانِ زار
میں تو مرجاؤں اگر گہوارہ جنبانی نہو

کیوں فریبِ سادگی ہو نشترِ جانِ خیال
یوں ستم کیجے کہ احساسِ ستم رانی نہو

خوگرِ بیداد ہوں فرخ ازل کے روز سے
ایسی مشکل ڈھونڈھتا ہوں جس میں آسانی نہو

فرخ بنارسی

شاعر

ہو سکی جب مادیت سے نہ تفسیرِ جمال　　ذہنِ فطرت میں ہوا تخلیقِ شاعر کا خیال
پہلے اُس کی روح کی تحقیق فرمائی گئی　　پھر نواؤ سوز سے تخلیق فرمائی گئی
پرتوِ روح القدس سے کرکے اُسکو فیضیاب　　وحی اور الہام سے لبریز دیدی اک کتاب
اُس پر اسرارِ حقیقت کردئے فطرت نے فاش　　عرش کی راہیں سب اُس پر کھول ڈالیں نے تلاش

"شاعر" آیا، کامیابِ منصبِ پیغمبری　　محفلِ عالم میں لے کر ایک شمعِ رہبری
"شاعر" آیا ابر بنکر، گونجتا گاتا ہوا　　مزرعِ ہستی پر اپنا سایہ پھیلاتا ہوا
"شاعر" آیا صورتِ جبریل پر تولے ہوئے　　لب سے دل تک راستے الہام کے کھولے ہوئے
مادی دُنیا کو "شاعر" نے دیا درس و پیام　　بھر گئی اُس کے پیام و درس سے دُنیا تمام

لیکن اے "شاعر" وہ تیری شان و عظمت کیا ہوئی　　وہ بلندی، اور وہ پرواز و رفعت کیا ہوئی
کیا ہوا "شاعر" وہ تیرا منصبِ پیغمبری　　قابلِ افسوس ہے تیری یہ بے بال و پری
اب تخیل ختم ہے تیرا چمن کی فصل تک　　اب تری پرواز ہے محدود ہجر و وصل تک

ہوشیار اے شاعرِ خوابیدہ قسمت ہوشیار　　ہے مٹانے کا ترے دورِ فلک کو انتظار
تیری فطرت کو زوال آئے کہیں ایسا نہ ہو　　نام بھی دُنیا سے مٹ جائے کہیں ایسا نہ ہو
قعرِ پستی سے اُبھر آنے کا پھر سامان کر　　جوش میں آ اور عالم میں بپا طوفان کر
دیکھ تیری قوم پھر تیرے لئے ہے بیقرار　　پھر ہر اک محفل میں ہے نغموں کا تیرے انتظار

اپنی قوت، اپنے ذہن، اپنی نوا سے کام لے
قافلہ تیار ہے۔ بانگِ درا سے کام لے

نبی احمد (بریلوی)

Accession No. 70316